فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوار ربانی	بعثتِ نبویؐ	پروفیسر محمد اکرم طاہر	8
قولِ نبیؐ	تزکیہ کرنے والے نبیؐ (حصہ دوم)	ڈاکٹر آسیہ شبیر	12
خاص مضمون	رمضان الکریم مہمان کریم	ام ایمان	16
نوائے شوق	حمد باری تعالیٰ	سید نصیر الدین نصیر	19
	نعت	نجمہ یاسمین یوسف	20
	نعت	شہود ہاشمی	20
	نعت	محمد شفیق اعوان	21
	عید مبارک	شمیم فاطمہ	21
	سن ارض وسما کے رکھوالے	اسما صدیقہ	22
حقیقت وافسانہ	بتاؤ تم میرا ساتھ دو گے	قانتہ رابعہ	24
	یادوں کی چادر	صبیحہ نبوت	26
	قسمت	فرحی نعیم	29
	محبت کی کیاری میں	قندیل سحر	36
	اک اور دریا کا سامنا تھا	جہاں آرا مظفر	38
انشائیہ	سفر ہے شرط	ربیعہ ندرت	40
نہاں خانۂ دل	رمضان ماہِ حساب	افشاں نوید	42
نمایاں خواتین کا تذکرہ	بی بی زلیخاؒ	آسیہ راشد	46
روداد	ایک شام گلِ دو پہر کے نام	فرحت طاہر	48
سیر و سیاحت	چند روز امارات میں	میمونہ حمزہ	51
ہلکا پھلکا	اُف یہ عالمی گاؤں	روبینہ عاطف	58
	بجنا اور بجانا	ڈاکٹر محمد ہمایوں یعقوب	60
خفتگانِ خاک	میری دادی جان	سامیہ افتخار احمد	62
زندگی کا فن	وقت زندگی ہے	عصمت اسامہ حامدی	65
مطالعہ گاہ	تبصرہ کتب	ڈاکٹر آسیہ شبیر	68
غذا و صحت	روزہ اور انسانی صحت	ڈاکٹر مقبول احمد شاہد	70
محشر خیال	کرامت بخاری، سید یاسر قاسمی، خورشید بیگم		73
بتول میگزین	فریدہ خالد، ام صائم، حفصہ افضال، ڈاکٹر فرح ارشد		76
گوشۂ تسنیم	دنیا بدل دو	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	79
منتخب کالم	خدارا ہمیں مسلمان ہی رہنے دو	انصار عباسی	81

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! ماہِ رمضان کی آمد مبارک ہو۔ اللہ اس مہینے اور عیدِ سعید کو ہمارے وطن اور عالمِ اسلام کے لیے خوشیوں اور برکتوں کا وسیلہ بنائے، امین۔ ماہِ رمضان، جو کہ ماہِ جشنِ قرآن ہے۔۔۔ انسانیت کو ہدایت ملنے پر شکر گزاری ہے۔۔۔ گمراہی سے بچ جانے کا نصاب عطا ہونے پر رب کی کبریائی کا اظہار ہے۔۔۔ اللہ کی سب سے بڑی نعمت کا احساس واعتراف ہے۔۔۔ جس نعمت کی خوشی منانے کے لیے ہم دن بھر بھوکے پیاسے رہ لینا گوارا کر لیتے ہیں۔۔۔ اور وہ بھی ایک دن نہیں، پورا ایک مہینہ۔۔۔ کیسے ہوسکتا ہے کہ اُسی نعمت سے منہ موڑ کر یہ مہینہ گزار لیں۔ اسی لیے تو ہر جانب قرآن کی محفلوں کی بہار ہے۔ جبریلِ امین نبی پاک ﷺ کو ان تیس دنوں میں قرآن کی دہرائی کروایا کرتے تھے۔ تراویح کا اہتمام اسی سنت کی پیروی ہے۔۔۔ یہ جو جگہ جگہ دورۂ قرآن برپا کیے جاتے ہیں، اسی عمل کا تسلسل ہے۔۔۔ بارش ہوتی ہے تو ہر طرح کی زمین اپنے ظرف کے مطابق سیراب ہوتی ہے۔ کون اس ماہ میں کتنا دامن بھر لے، یہ اس کی ہمت!

کیسی عجیب بات ہے کہ روزہ۔۔۔ جسمانی مشقت پر مبنی ایک عبادت، روحانی بلندی دینے کا وسیلہ بن سکتی ہے۔۔۔ اخلاقی بہتری کا سبب ثابت ہوسکتی ہے! محض ایک ماہ کے لیے، اور وہ بھی مخصوص اوقات میں، بشری تقاضوں کو پورا نہ کرنا انسان کو شخصی تطہیر کا وہ مقام عطا کرسکتا ہے جس کے لیے راہب کئی کئی سال کے پُر مشقت چلّے کاٹا کرتے ہیں۔۔۔ نفس کو ان آلائشوں سے پاک کرسکتا ہے جو اس کو مطلوب طرزِ زندگی سے دور کر دیتی ہیں۔ آج کے دور کے مشکلوں میں گھرے ہوئے انسان کے لیے، پریشان حال اور مصیبت زدہ نفوس کے لیے۔۔۔ منافقت، حسد، ریا، حرص، جھوٹ اور خود غرضی کے شکار دلوں کے لیے۔۔۔ رمضان المبارک وہ ہمہ پہلو تھیرپی ہے جس کی برابری کسی انسانی علاج کے لیے ممکن نہیں۔۔۔ وہ نعمت ہے جو انسانی زندگی کے لیے رحمتوں، برکتوں اور آسانیوں کے لاتعداد دروازے کھولتی ہے۔ راہِ خدا میں خرچ کے لیے ہاتھ خود بخود کھلتا ہے۔۔۔ مال سے محبت کم ہوتی ہے۔۔۔ اپنے جیسے انسانوں کا احساس دل میں جاگتا ہے۔ پھر آخری عشرہ جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔۔۔ اور جس کی خاطر نبی کریم ﷺ کمر کس لیا کرتے تھے۔ اس میں یہ راتوں کا جاگنا نیند توڑ کر رب سے لو لگانے کی مشق ہی تو ہے!

اے خدا!

میری دعا ہے کہ میں جب تجھ کو پکاروں
تو مری رات کے ماتھے پہ ترے نام کا سورج دمکے
اے خدا! میری دعا ہے کہ کسی صبح جب آنکھیں کھولوں
میری سانسوں میں ترے قرب کا گلشن مہکے

ملکی حالات کئی حوالوں سے پریشان کن ہیں۔فوجی آپریشن نے ایک بار پھر لاکھوں کی آبادی کو اپنے ہی ملک میں مہاجر بنا دیا ہے۔یہ وہ پاکستانی ہیں جو گزشتہ ۱۴ برسوں سے ہر عتاب کا نشانہ بن رہے ہیں۔اوراب جب کہ گرمی پورے جوبن پر ہے اور روزوں کا مہینہ، یہ بے گھری کا عذاب سہنا بھی انہی کی قسمت بنا ہے۔یہ لوگ ہماری ہر نوعیت کی امداد کے اولین حقدار ہیں۔دہشت گردی کے پراسرار واقعات تسلسل کے ساتھ جاری ہیں۔لگتا ہے صرف کراچی ہی نہیں سارا ملک نامعلوم افراد کے ہاتھوں میں یرغمال ہے۔پریڈ لین راولپنڈی، پی اے ایف بیس کراچی، ائر بیس کامرہ، پشاور ائر پورٹ، جوزف کالونی لاہور، کوئٹہ کے زائرین۔۔۔کس کس سانحے کا نام لیا جائے!لاہور میں سری لنکن کرکٹ ٹیم پر حملے کے بعد ایسے ہی بیشمار واقعات ہماری قسمت بن چکے ہیں جن کی تحقیقات نہ ہونا کہیں طے پا گیا ہوتا ہے(کہیں طے پا گیا ہے شہر کا مسمار رہنا!!)اسی ماہ کراچی ائر پورٹ پر حملہ ہوا،فوج کا بیان آیا کہ اسلحہ بھارتی ساخت کا تھا اور تربیت فوجی انداز کی تھی،مگر پھر چپ سادھ لی گئی۔آخر وہ کون سی مجبوریاں ہیں جن کی بنا پر ہم عوام کو حقائق سے آگاہ نہیں کر سکتے ؟اور سانحہِ ماڈل ٹاؤن نے تو جیسے ہماری کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ان کھلی دہشت گردیوں کی پلاننگ کہاں ہوتی ہے اور ان کے آلہِ کار بننے والے ہمارے کون لوگ ہیں؟ بیرونِ ملک بیٹھ کر ملک و قوم کا غم کھانے والے لیڈروں کی ڈوریاں کون ہلاتا ہے؟ طالبان کے نام پر پاکستان کو کون عراق اور افغانستان بنانا چاہتا ہے؟ ہمارے حسّاس ادارے اور نیوکلیائی اثاثے دراصل کس سے خطرے میں ہیں؟ کیا ایک آدھ وزیر قربان کر دینے سے ان سوالات کے جواب مل سکتے ہیں جو آج ہر چہرے پر لکھے ہیں؟ کیا ان طفل تسلّیوں سے ملک کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ ہر بار مجرم نامعلوم ہوتے ہیں؟ کیا بھارت کے ساتھ کاروباری مفادات پر ملکی مفادات کو بھینٹ چڑھا دینے کا فیصلہ ہی کر لیا گیا ہے؟

شاہنواز زیدی کے ان اشعار کے ساتھ اجازت اور دعا کی طلب گار ہوں۔

اس کی آنکھوں میں محبت کا گماں تک نہیں آج
کون سی آگ تھی وہ جس کا دھواں تک نہیں آج

آہنی راستے اگتے ہیں درختوں کی جگہ
والیِ شہر کو احساسِ زیاں تک نہیں آج

ہم ہیں تاریخ کی راہوں کے مسافر جن کی
یہ نشانی ہے کہ ایسوں کا نشاں تک نہیں آج

بات تو گرچہ بہت دور تلک جاتی ہے
آج بس اتنا ہی کافی ہے، وہاں تک نہیں آج

آپ سب کو اپنے متعلقین سمیت عیدالفطر کی خوشیاں مبارک ہوں۔

دعا گو

صائمہ اسما

پروفیسر محمد اکرم طاہر

بعثت نبوی ﷺ

بعثت نبویؐ بنی نوع انسان کے لئے دہری نعمت ہے۔ آپؐ نے ایک طرف مخلوق سے خالق کو ملایا اور دوسری طرف انسان کوانسان سے ملادیا۔ مخلوق کی خالق سے دوری اور بے اعتنائی کا عالم بھی عجیب تھا۔ کہیں اللہ کا کھلم کھلا انکار کیا جارہا تھا۔ کہیں بے جان مورتیوں، بے حس درختوں اور موذی جانوروں نیز فطرت کی بے رحم طاقتوں کے سامنے سجودِ نیاز لٹائے جارہے تھے اور کہیں تمام خدائی اختیارات اپنے جیسے انسانوں کوتفویض کردیئے گئے تھے۔ رسول کریمؐ نے انسان کوشرفِ انسانیت سے آگاہ کیا۔ خوشی وغمی میں، عیش وطیش میں، امن وجنگ میں، بےبسی وسیادت غرض ہر حال میں خدائے واحد سے تمام امیدیں وابستہ کرنا سکھایا۔ دستِ سوال بھی اس ذات کے آگے دراز کیا اور اظہار تشکر بھی اسی سے کیا۔ فتح مکہ کے تاریخی موقع پر جب شہر مکہ میں آپ ﷺ داخل ہو رہے تھے تو سرِ اقدس بارگاہِ صمدیت میں جھکا ہوا تھا۔ اظہارِ عجز سے پیشانی مبارک بار بار اپنی اونٹنی کے کجاوے سے چھوجاتی تھی۔ سفرِ طائف کے موقع پر جب ہرطرف سے پتھروں کی بارش ہورہی تھی تو خالق حقیقی کے ساتھ آپ ﷺ کے قلبی تعلق کی جو کیفیت تھی وہ آپ ﷺ کی اس دعا سے ظاہر ہے جو انتہائی مایوس کن حالات میں بھی خالق ومخلوق کے باہمی تعلقات کے لئے شاہ کلید کا درجہ رکھتی ہے۔

''اے اللہ! میں تجھ سے اپنی کمزوری اور تدبیر کی کمی اور لوگوں کی بے توقیری کی شکایت کرتا ہوں۔ اے ارحم الرحمین ! تو کمزوروں کا خاص طور پر مربی اور مددگار ہے۔ تو مجھے کس کے سپرد کرے گا؟ کسی غضب ناک اور ترش رو دشمن کی طرف یا کسی دوست کی طرف کہ جس کو تو میرے امور کا مالک بنائے۔ اگر تو مجھ سے ناراض نہ ہوتو پھر مجھے کسی کی پروانہیں، مگر تیری عافیت اور سلامتی میرے لیے باعثِ صد سہولت ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غضب اور ناراضی مجھ پر اترے اور اصل مقصد تجھ ہی کو سنانا اور راضی کرنا ہے۔ بندہ میں کسی شر سے پھرنے اور خیر کے کرنے کی

قدرت نہیں مگر جتنی تیری بارگاہ سے عطا ہوجائے۔''(۱۵)

رسول اللہ ﷺ نے بندوں کو بندوں سے یوں ملایا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں فاصلے سمٹ گئے۔ اللہ سے تعلق کا مدعی مخلوق سے بیزار نہیں ہوسکتا اور مخلوق سے پیار کرنے والا اللہ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ انسانوں کے باہمی تعلقات میں ہر اس حرکت سے منع کر دیا گیا جو آپس میں نفرت وحقارت یا قطع تعلق کا باعث بن سکتی ہے۔ باہم ہنسی مذاق میں مخاطب کی عزت نفس کا خیال نہ رکھنا، تجسس (ایک دوسرے کے چھپے ہوئے عیوب کی کھوج میں لگے رہنا) تنابز بالالقاب (ایک دوسرے کے نام بگاڑنا) سوئے ظن، غیبت اور بہتان اسلام کی رو سے سخت گناہ ہیں۔ باہمی تعلقات میں حسنِ ظن اور حسن اخلاق کو اصل اہمیت حاصل ہے۔ ایک حدیث پاک کے مطابق مومن بھائی سے مسکرا کر ملنا بھی صدقہ ہے۔ (ترمذی) مخاطب کے ساتھ نظریاتی مباحث میں بھی ''احسن'' طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بندوں کے باہمی تعلقات میں نبی کریم ﷺ نے تمیز بندو آقا مٹا کر رکھ دی۔ ایک بڑھیا مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ ایک رات اس کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں نے آپ ؐ کے آرام کے پیشِ نظر اطلاع نہ دی اور رات گئے دفن بھی کر دیا۔ صبح آپ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو سخت خفا ہوئے اور غریب خاتون کی قبر پر جا کر دعائے مغفرت کی۔ باہمی تعلقات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ معاشرتی زندگی میں بالخصوص گھریلو زندگی میں بچوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہ کیا جائے۔ ایک صحابیؓ اپنے ایک لڑکے کو ایک خادم دینا چاہتے تھے اور اس پر رسول ﷺ کی گواہی کے خواہاں تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا ''کیا باقی بچوں کو بھی الگ الگ خادم دیا گیا ہے۔'' جواب نفی میں آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''میں ناانصافی اور حق تلفی کی باتوں پر گواہ نہیں بنا کرتا۔'' حسنِ خلق کے معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق بھی آپ ﷺ کے نزدیک بے معنی تھا۔ آپ ﷺ ایک یہودی کے مقروض تھے۔ وہ قرض کا تقاضا لے کر آیا اور نہایت بدتمیزی سے پیش آیا۔ حضرت عمرؓ کو اس کی حرکت پر سخت غصہ آیا اور وہ اسے مارنے کو دوڑے۔ آپ ﷺ نے مسکرا کر یہودی سے کہا ''ابھی تو وعدہ کے مطابق ادائیگی میں تین روز باقی ہیں۔'' پھر عمر فاروقؓ سے فرمایا ''عمرؓ! میں اور یہودی تم سے ایک اور برتاؤ کے زیادہ مستحق تھے۔ تمہیں چاہیے تھا مجھے بہتر

ادائیگی کے لئے کہتے اور اسے بہتر تقاضے کے لئے۔'' (البیہقی) اس کے ساتھ ہی آپؐ نے حضرت عمر فاروقؓ کو ہدایت کی فلاں شخص سے کھجوریں لے کر اس کا قرض واپس کر دیں اور کچھ زائد بھی دیں کہ یہودی کو عمر فاروقؓ نے سخت ڈانٹ جو پلائی تھی۔

انسانوں کے باہمی تعلقات کو تعمیری بنیادوں پر استوار کرنے کیلئے رسول مکرمؐ نے معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں کی امداد و استعانت کے لئے صاحب استطاعت لوگوں کو عملی طور پر ابھارا۔ بیت المال سے یتامیٰ، مساکین، بیوگان اور مطلقہ خواتین کی امداد کے لئے نہ صرف قوانین سازی کی گئی بلکہ مختلف ترغیبات کے ذریعے غربا اور مستحق لوگوں کیلئے امدادِ باہمی کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا۔ رمضان کے روزے کو قصداً توڑ دینے کیلئے کفارہ صیام، بیوی کی شان میں شان زوجیت کے خلاف نازیبا کلمہ بول دیا تو کفارہ ظہار اور قسم کھا کر توڑ دی تو کفارہ یمین اسی امداد باہمی کے نظام کی مختلف شکلیں ہیں۔ پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں رسول اللہﷺ نے اس قدر تاکید فرمائی کہ صرف میراث میں انہیں شریک کرنے کی کسر باقی رہ گئی۔ جاہل اور آداب معاشرت سے نابلد لوگوں کے ساتھ نرمی اور ملائمت سے پیش آنے کا حکم دیا گیا۔ ایک بدوی مدینہ میں آیا اور مسجد نبویؐ ہی میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ صحابہ کرامؓ اسے مارنے دوڑے۔ آپؐ نے فرمایا: اسے فارغ ہو لینے دو۔ وہ فارغ ہوا تو آپؐ نے اسے مسجد کے تقدس سے آگاہ کیا۔ پانی کا ڈول منگوایا اور غلاظت کو بہا دیا گیا۔ (مشکوٰۃ جلد اول) باہمی تعلقات کے لئے محض نصیحت اور روایت سے کام نہیں لیا گیا۔ جو لوگ رحمٰن کو چھوڑ کر شیطان کے پیچھے چل پڑیں اور ظلم و تعدی کو اپنا شعار بنالیں، قانون کی طاقت سے بھی پہلے ان کا قریب ترین خیر خواہ ہی ان کا سب سے بڑا محتسب ہوتا ہے اور اپنے اس فرض کی ادائیگی پر وہ عنداللہ ماجور ہوگا۔ اس سلسلے میں رسول اکرمؐ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کر، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہؓ نے پوچھا: یارسول اللہﷺ مظلوم کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، ظالم کی مدد کیونکر کی جائے؟ آپؐ نے فرمایا: ظالم کو ظلم سے روک دینا اس کی مدد کرنا ہے۔

زندگی چونکہ ایک مکمل وحدت کا نام ہے۔ اس لیے اسے روح و مادہ یا دین و دنیا کے دو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ روح و مادہ باہم اس طور پر متعلق ہیں کہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ دنیا کو

ترک کر کے دین پر عمل کرنے کی ہر کوشش رہبانیت ہے اور دین کو بالائے طاق رکھ کر دنیا کے پیچھے بھاگنا چنگیزیت ہے۔ اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش ہے نہ چنگیزیت کی۔ اسلام میں تجارتی اور پیداواری سرگرمیوں کی خوب حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ دنیا کی ساری سرگرمیاں بشمول سیاست ومعیشت مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اصل مقصد اور ہدف رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ قرآن حکیم میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ (النور:37)

''وہ (جواں) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور خرید وفروخت یادالٰہی سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے۔''

دراصل اسلام کی اخلاقی وروحانی اقدار زندگی کے تمام مادی شعبوں میں برقی رو بن کر دوڑتی رہتی ہیں۔ جس سے بظاہر دنیاداری کے کام بھی عملاً دینی امور قرار پاتے ہیں۔ قرآن پاک میں مالی معاملات میں گواہی لکھنے کا طریقہ بتانے کیساتھ ہی تاکید کر دی گئی کہ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (البقرہ:282) ''اور اللہ سے ڈرے جو اُس کا رب ہے۔'' مالِ غنیمت کی تقسیم جیسے خالص معاشی مسئلے کو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا: إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ (الانفال) ''اگر تم اللہ پر اور جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر حق وباطل میں فرق کرنے والے دن نازل کیا ہے اس پر یقین رکھتے ہو۔'' کفار سے جنگ وصلح کے بین الاقوامی قوانین بیان کرتے ہوئے بھی تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کفار صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھکو۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (الانفال) ''اور اللہ پر توکل کرو۔'' سیرت النبی ہی وہ مثالی زندگی ہے جس میں دین ودنیا باہم شیر وشکر نظر آتے ہیں۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ گھر میں خوش طبعی فرماتے اور جونہی اذان کی آواز بلند ہوتی، آپ مسجد یوں روانہ ہوتے جیسے ہمیں جانتے تک نہیں ہیں۔ گویا گھریلو امور سے وابستگی مسجد کے اندر حقوق اللہ کی ادائیگی میں حارج نہ ہوتی۔ اس طرح مسجد میں حاضری حقوق العباد کی ادئیگی سے۔ آپؐ نے حقوق والدین کی قیمت پر ہجرت کی اجازت نہ دی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ میں اپنے ماں باپ کو روتے ہوئے چھوڑ آیا ہوں کہ آپ ﷺ سے ہجرت پر بیعت کروں۔ آپؐ نے

فرمایا: واپس لوٹ جاؤ اور انہیں اس طرح ہنساؤ جیسے تو نے انہیں رلایا ہے۔'' (ابوداؤد۔کتاب الجہاد)

انبیائے کرام میں رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں تو سب سے بڑے معلم اخلاق بھی آپؐ ہی ہیں۔ حدیث پاک میں ہے ''مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔'' فضائل اخلاق کیا ہیں اور رذائل اخلاق کون کون سے ہیں؟ اس موضوع پر قدیم اور جدید مفکرین وفلاسفہ کے ہاں بہت طویل مگر بے کیف مباحث ملتے ہیں۔ قدیم وجدید مفکرین میں بعض حصولِ لذت کو بعض نے ترک لذت کا اخلاقیات کا جوہر قرار دیا۔ اسی طرح تاریخ کے مختلف ادوار میں کسی نے ں ہے تو تعلق باللہ اور فکر آخرت جیسی کسی آئیڈیل (Perfection) کی تلاش کرنے لگا مگر بس شکوک ہوجاتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے ان دو اعتقادی بنیادوں پر اخلاقیات کے ایسے تمام بنیادی مسائل کو حل فرمایا جو نکتہ وروں سے حل نہ ہوسکے تھے۔ بڑی سے بڑی اور مفصل بات کو چند جملوں بلکہ لفظوں میں اختصار کے ساتھ بیان کرنا آپؐ کی منفرد خصوصیات میں سے ہے۔ صحیح احادیث میں آپؐ سے مروی روایات حکمت ودانش کے جواہر پارے ہیں۔ نبی آخرالزماںؐ نے ایک مختصر جملے میں امت کو خبردار کردیا تھا۔ ''وہ شخص جو مجھے ان دوچیزوں کی ضمانت دے جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے (جنسی اعضا) اور جو اس کے جبڑوں کے درمیان ہے (زبان) میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔'' شرم وحیا کے بارے میں ارشاد ہے: ''اگر تجھ میں حیا نہیں تو جو چاہے کر۔'' امانت اور ایفائے عہد کے بارے میں فرمایا: ''وہ مومن نہیں جس میں امانت نہیں اور اس کا کوئی دین نہیں جو وعدہ کا پابند نہیں۔'' حق وصداقت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: ''کوئی مومن بزدل بھی ہوسکتا ہے، بخیل بھی ہوسکتا ہے مگر جھوٹا ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' (ترمذی، ابوداؤ) رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد پرامن معاشرتی زندگی اور بقائے باہمی کی مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو کہ وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔'' اسی طرح نیکی اور بدی کی تعریف کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا ''نیکی حسنِ خلق کا نام ہے اور بدی وہ کام ہے جو تو چھپ کر کرے اور تجھے ناگوار ہو کہ لوگ اس سے مطلع ہوں۔'' قرآن پاک میں بڑے بلیغ انداز میں نیکی کو ''معروف'' اور بدی کو ''منکر'' کہا گیا ہے۔ یعنی نیکی وہ ہے جسے ہر انسان اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں خیر سمجھتا ہے اور منکر وہ ہے جو

ہر انسان کے نزدیک شر ہے۔

اخلاقیات کا ایک نزاعی مسئلہ یہ بھی ہے کہ اچھے مقاصد کے لئے غلط ذرائع کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے مقاصد اور ذرائع میں اس تفریق کو بھی بے معنی ثابت کردیا۔حقیقت یہ ہے کہ ناجائز ذرائع کے استعمال سے انسان کامیاب ہوکر بھی گویا ناکام رہتا ہے اور جائز استعمال کرکے وہی انسان ہار کر بھی (اگر وہ وقتی طور پر ہار جائے) بالآخر کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے، کردار کے حسن وقبح کا اندازہ مقاصد کے ساتھ ساتھ ذرائع سے بھی لگایا جاتا ہے۔قرآن حکیم میں ہمیشہ کے لئے طے کردیا گیا اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود:114) ”بے شک نیکیاں برائیوں کو کھا جاتی ہے۔“ دعوت وتبلیغ کے بالکل ابتدائی مرحلے میں تمام مصلحین امت کے لیے لازم کیا گیا۔اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ (المومنون:96) ”تم بدی کو اچھے طریقے سے دفع کرو۔“

اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ بنیادی انسانی اخلاقیات کا تحفظ بہر صورت مقدم ہے۔مقصد اور ذرائع میں مصنوعی تفریق کا ایک انتہائی ناگوار اثر یہ ہوا کہ الہامی تعلیمات کے حامل بعض اہل کتاب بھی گمراہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔قرآن حکیم نے ان کے ایک قول کا حوالہ دیا ہے۔ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (آل عمران:75) ”وہ کہتے ہیں امیوں (یعنی غیر یہودی لوگوں) کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔“

بائبل قرض اور سودے کے احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان فرق روا رکھتی ہے۔تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا۔تالمود میں ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیل کے بیل کو زخمی کردے تو اس پر کوئی تاوان نہیں۔مگر غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کردے تو اس پر تاوان ہے۔اگر کسی شخص کو کسی جگہ پر کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد وپیش کی آبادی کن لوگوں کی ہے۔اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے۔غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

ڈاکٹر آسیہ شبیر

تزکیہ کرنے والے نبی ﷺ

دورِ حاضر میں تعلیم کو عام کرنے کا جو غلغلہ ہے، آج سے پہلے شاید کبھی اتنا نہ تھا۔ لازمی ابتدائی تعلیم کے تصور کے ساتھ، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا رجحان روز افزوں ہے۔ تدریس اب ایک فن قرار پائی ہے اور اس کی مہارتوں کا حصول ایک استاد کے لیے ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ اساتذہ کی تعلیمی ورک شاپس، ٹیکنالوجی کا مؤثر استعمال، گفتگو اور تدریس میں اختیار کیے جانے والے مؤثر انداز، نئی معلومات کا حصول اور انھیں طالب علموں تک منتقل کرنے کا بہتر اسلوب، کتنے ہنر ہیں جو آج کے استاد میں مطلوب ہیں۔ طالب علم کے لیے ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے اور کسی شعبہء علم کی عملی زندگی میں ''افادیت'' کا سوال بھی شدت سے اٹھا ہے۔

یہ سب معاملات گو اپنی جگہ بے حد اہم ہیں، لیکن مشرق ہو یا مغرب، المیہ ایک ہی ہے۔۔۔ جسدِ تعلیمی کے ان سارے اجزاء کی بجائے خود اہمیت کے باوجود تعلیمی عمل کی حقیقی روح، یعنی تربیت و تزکیہ، عملاً مفقود ہے۔ یہ وہ معاملہ تھا جسے ہر مرحلے پر اور ہر حوالے سے نمایاں تر مقام دینے کی ضرورت تھی۔ اسے نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ اعلیٰ ترین سیاسی یا معاشرتی قیادت ہو، یا فنون اور سائنسی علوم کے ماہرین، الا ماشاء اللہ، دیانت و امانت اور اخلاقی زندگی کے مطلوب معیار سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں۔ اسلامی نقطہء نظر سے دعوت انبیاء کرام علیہم السلام میں تعلیم اور تزکیہ ہمیشہ لازم و ملزوم رہے ہیں۔ انبیاء کرام کی تعلیمات اور ان کے اثرات کے سرسری مطالعے سے بھی یہ تعلق نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کتب سابقہ اور خاص طور پر اناجیل اربعہ اس پر گواہ ہیں۔ وہ اولین حواری، جن کو مچھلیاں پکڑتے دیکھ کر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے دعوت دی تھی کہ آؤ! میں تمھیں آدم گیر بناؤں گا (انجیل متی) اور جو سفر و حضر، فاقہ مستی اور بیاباں نوردی میں حضرت مسیحؑ کے ساتھ وابستہ رہے، انھوں نے اس مصاحبت سے جو کچھ پایا وہ ان کے دور میں کسی اور کو حاصل نہ تھا۔ بروایتِ انجیل آتشیں زبانیں، معجزات کی

قدرت، دعوت کا جوش واضطراب، خدا کی خاطر محبت کا جنون اور فروتنی وانکساری کی دولت کا حصول۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود ان کے بارے میں گواہی دی کہ تم ''زمین کا نمک'' اور ''پہاڑی کے چراغ'' ہو۔ (انجیل متی)

معلم انسانیت نبی مہربان صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اصحاب کے لیے فرمایا تھا:

'' اصحابی کالنجوم۔ بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔''

(مشکوٰۃ المصابیح)

میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، جس کی پیروی کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔

مکتب نبوت کے یہ نتائج، زمانی فاصلوں کے باوجود، اتنے یکساں تھے کہ عام دیکھنے والے بھی بچشم سر اس مماثلت کا احساس کر لیتے تھے۔ شام کے نصاریٰ نے جب اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھا تو بے اختیار کہہ اٹھے کہ یہ تو ''مسیحؑ کے حواریوں جیسے ہیں''۔ (التفسیر الکبیر رازی)

تزکیۂ نفس اور نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین تھے۔ آپؐ کے واسطے سے انسانوں کو آسمانی رہنمائی کے جو تکمیلی اسباق ملے، ان میں تعلیم نبوت کا مقصودِ حقیقی تزکیہ ہی کو قرار دیا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے ساتھ، کعبہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے بعثتِ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو دعا فرمائی کہ اے اللہ، ان میں انھیں میں سے ایک رسول اٹھانا جو انھیں تیری آیات پڑھ کر سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ (البقرہ) صرف یہی دعا ہے جہاں تزکیہ کو آخر میں ذکر کیا گیا۔ قرآن مجید کی دیگر تین آیات میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں تعلیم کتاب وحکمت موخر کی گئی ہے اور تلاوت آیات اور تزکیہ کے حصول کو مقدم۔ (البقرہ، آل عمران، الجمعہ) اس تقدیم سے واضح ہے کہ تزکیہ وتربیت، کتاب وحکمت کی تعلیم کو اور دیگر علوم نافع کو قلب وذہن میں جاگزیں کرنے اور ان کے مکمل فوائد وثمرات کے حصول کیلئے ناگزیر ہے۔

''نفوس انسانی کو غلط میلانات ورجحانات سے موڑ کر نیکی کے راستے پر ڈالنا اور درجہء کمال تک پہنچنے کے لائق بنانا'' (تزکیہءنفس) اگر تزکیہ کا مفہوم ہے تو

نبی کریمؐ کی دعوت کا اولین تعارف یہی تھا۔

بخاری نے حضرت ابوذر غفاریؓ تک دعوت اسلام پہنچنے کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کو جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے بھائی کو پتہ کرنے کیلئے بھیجا ''میرے پاس اس شخص کی خبر لے کر آؤ جو زعم رکھتا ہے کہ وہ نبی ہے اور اس کے پاس آسمان سے خبریں آتی ہیں۔ اس کی بات اچھی طرح سننا پھر مجھے آ کر بتانا۔'' ان کے بھائی نے آ کر صرف دو جملوں میں نبیؐ کے احوال ذکر کیے۔ ''رأيته يامر بمكارم الاخلاق . وكلاماً ما هو بالشعر''۔ (بخاری شریف) یعنی میں نے انہیں دیکھا کہ وہ پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اور جو کلام وہ سناتے ہیں وہ شاعری نہیں ہے۔

ابوسفیان قبل از اسلام قیصر کے دربار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے طلب کیے گئے تھے۔ قیصر نے ان سے نبی کریمؐ کے نسب، ان کے پیروکاروں کی دین پر استقامت، اور خود نبیؐ کے ذاتی معاملات کے بارے میں سوال کرنے کے بعد پوچھا کہ وہ تمھیں کیا کرنے کو کہتے ہیں۔ (ماذا يأمركم؟) ابوسفیان کا جواب بھی عقائد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفوس کے لائحہء عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

''قلت: يقول: اعبدوا الله وحده ولا تشركوا به شيئا واتركوا ما يقول آباء كم ويأمرنا بالصلاة والصدق والعفاف والصلة؟ (بخاری شریف) یعنی ابوسفیان نے کہا وہ کہتے ہیں صرف ایک خدائے واحد کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور جو تمہارے آباؤ اجداد کہتے ہیں اس کو چھوڑ دو اور وہ ہمیں نماز، سچائی، پاکیزگی اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ تزکیے کا عمل اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگیوں میں ظاہر ہوا تو اہل ایمان شکر کے جذبات کے ساتھ اس کا تقابل اپنی سابقہ زندگی سے کرتے تھے۔ حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر فرمائی، جسے ابن ہشام نے روایت کیا ہے ،اس میں انھوں نے مسلمانوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے رہبانیت، تقشّف اور زہد و عبادت گزاری کا نہیں بلکہ ان صفات کا ذکر کیا جو رذائل نفس کو مٹا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس تقریر میں اسلامی اور جاہلی طرز زندگی کا

فرق چند جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ انھوں نے فرمایا: ''اے بادشاہ ہم جاہل تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ مردار کھاتے اور بے حیائی کے کام کرتے تھے۔ قطع رحمی کرتے تھے اور ہمسایوں سے برا سلوک کرتے تھے۔ ہم میں سے قوی، ضعیف کو کھا جاتا تھا۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا جس کے نسب، امانت اور پاک دامنی سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت دی کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے آباء جن بتوں اور پتھروں کی عبادت کرتے تھے، ان کو چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت کا پاس کرنے، ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرنے، حرام چیزوں اور خون ریزی سے بچنے کا حکم دیا۔ جھوٹ بولنے، یتیموں کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا اور حکم دیا کہ ایک خدا ہی کی پرستش کرو۔'' (ابن ہشام)

تزکیہء نفوس کی اس دولت ہی کی وجہ سے مسلمانوں میں بہادری، شجاعت اور انسانی ہمدردی کے وہ بے پایاں جذبات بیدار ہوئے جن کے بل پر انھوں نے دیگر انسانوں تک بھی اس دعوت کو پہنچانے کے لیے سارے خطرات مول لیے۔ شاہ ایران یزدگرد کے دربار میں حضرت مغیرہ بن زرارہؓ نے، مسلمانوں کی آمد کا مقصد یہ بیان کیا تھا۔ **اخراج العباد من عبادة العباد الى عبادة الله الواحد القهار۔** (بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ واحد قہار کی بندگی میں دینا) اس کے ساتھ ساتھ حضرت جعفرؓ ہی کی طرح اخلاق و کردار کی ان پستیوں کو بیان کیا جن میں وہ اسلام سے پہلے مبتلا تھے اور اس تبدیلی کا ذکر کیا، جو اسلام قبول کرنے کے بعد ان میں رونما ہوئی۔ (تاریخ طبری) حضرت مغیرہؓ کے اس واقعے سے استدلال کرتے ہوئے مشہور مستشرق، گستاولی بان نے گواہی دی: ''کچھ ہی کیوں نہ ہو، حضرت رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ملک عربستان میں وہ اخلاقی نتائج پیدا کر لیے جو کوئی مذہب قبل از اسلام (اپنے پیروکاروں میں) پیدا نہ کر سکا تھا''۔ (تمدنِ عرب)

اکثم بن صیفیؓ کے نمائندوں کے سامنے، ان کے سوالات کے جواب میں آپ نے جو دعوت رکھی وہ قرآن مجید کے پیش کردہ تزکیہ کے پورے مفہوم پر حاوی ہے۔ آپ نے فرمایا میری دعوت یہ ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ (ابن کثیر) یعنی بے شک اللہ عدل، احسان اور رشتہ داروں پر خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش کاموں برائیوں اور (اللہ کی) نافرمانی سے منع کرتا ہے۔

تزکیہ:۔۔۔۔علمی اور عملی زندگی کی روحِ رواں

مذہبی اور تعلیمی زندگی کی تاریخ میں نبی کریم، معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کارنامہ سرفہرست رکھے جانے کے لائق ہے کہ آپ نے ایک تو تزکیہ کا وہ جامع مفہوم پہلی مرتبہ انسانوں کے سامنے پیش کیا جس کو ہمیشہ افراط وتفریط میں گم کیا جاتا رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تزکیہ کے عمل کو زندگی کی روحِ رواں بنا دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو ''دین قیم'' لے کر آئے، اس میں تزکیہ نیت، عقیدے، عمل، عبادات، اخلاقیات اور معاملاتِ زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ دین اور دنیا کی ساری بھلائیاں بیک وقت مطلوب بھی ہیں اور محمود بھی۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے سعادتِ انسانی کے تعین کے حوالے سے بحث میں بڑے مؤثر دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ نظام کائنات ہو یا نظام انسانی، ان دونوں کی بقا، استحکام اور استمرار کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں پوری طرح ادا کرنا اور اس سب مشغولیت کے باوجود زندگی کے روحانی تقاضوں کو فراموش نہ کرنا اور حتی المقدور اس حوالے سے کوشش اور جدوجہد میں مصروف رہنا، انسان کی حقیقی سعادت ہے اور اس میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ہر پہلو کے حوالے سے یہی تعلیم عطا فرمائی۔ مثلاً نکاح کو سنت قرار دیا اور یہاں تک فرمایا۔ **فمن رغب عن سنتي فليس مني**۔ یعنی جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ (بخاری شریف) اپنی امت کے لیے یہ نہیں مقرر فرمایا کہ اچھا وہ ہے جو گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جائے، جسم کے ''ناپاک تقاضوں'' کو پورا کرنے کی بجائے ''نجات'' کے حقیقی مقصد کو سامنے رکھے اور رشتہ وپیوند کے کسی ''مایا جال'' میں گرفتار نہ ہو۔ (تاریخِ مذاہب رشید احمد) بلکہ فرمایا کہ ''**خیر کم خیر کم لاھلیکم، وانا خیر کم لأھلی** یعنی تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہو اور میں تم سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے ساتھ

اچھا ہوں (سنن الترمذی)۔گھر اور خاندان کو تعلیم اور تربیت کا اولین مرکز بنایا جہاں ''عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں پر نگران ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔'' (بخاری شریف) اور باپ کو یوں ذمہ دار بنایا کہ ''کوئی باپ اپنی اولاد کو حسن ادب سے بڑھ کر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا'' (مشکوٰۃ المصابیح)۔ والدین اور اولاد کے ساتھ ساتھ قرابت داروں، ہمسایوں، اہل حاجت، حتی کہ چند گھڑیوں کی مصاحبت جس کے ساتھ ہو جائے، اس کے بھی حقوق مقرر فرمائے گئے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن کو کامیابی کا معیار قرار دیا گیا۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

قرآن مجید میں نصاریٰ کے رہبانیت اختیار کرنے کے محرک، یعنی خوشنودی رب کی تلاش کو قابل مذمت نہیں ٹھہرایا گیا، ''بدعت'' ان کے رہبانی احکام وقوانین ایجاد کرنے کو قرار دیا اور اس کی مذمت کی گئی۔ (الحدید) اپنے سے متصل قبل کی اس امت کے ''افراط'' کے طور طریقوں سے سبق اخذ کرتے ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو غلو اور تشدد وتعمق کی طرف جانے سے سختی سے روکا۔ فرمایا: اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ تم پر سختی کرے۔ ایک گروہ نے یہی تشدد اختیار کیا تھا تو اللہ نے بھی اسے سخت پکڑا۔ دیکھ لو وہ ان کے بقایا راہب خانوں اور کنیسوں میں موجود ہیں۔ (ابوداؤد) قرآن مجید ایک دن میں صرف اتنا پڑھنے کی اجازت دی کہ تفکر وتدبر ہو سکے اور بارِ خاطر نہ ہو (ابوداؤد)۔ نماز اور نوافل اتنے ہوں کہ رسی باندھنے اور اس کا سہارا لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ (ابوداؤد) بعض صحابہ کے بہت اصرار کے باوجود بار بار نصیحت فرمائی کہ روزے اتنے نہ ہوں کہ نظام جسمانی معطل ہو جائے اور حقوق وفرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ ہونے لگے۔ (بخاری شریف) ایک موقع پر تو یہاں تک فرمایا کہ اگر روزے کی وجہ سے کوئی شخص دوسروں کی خدمت کا محتاج ہو جائے تو وہ لوگ اس سے اجر وثواب میں آگے بڑھ جائیں گے جو انسانی ہمدردی اور خدمت کا کام کریں گے۔ (مسلم شریف)

مالی معاملات میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توازن اور اعتدال کو برقرار رکھنے کی ہدایات عطا فرمائیں، اگرچہ صدقہ پر زور بھی دیا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ان مومنین صادقین میں سے تھے جو غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ پچاس دن بعد جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کے سامنے اپنا کل مال صدقہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن آپ نے ہدایت فرمائی کہ سب نہیں، کچھ رکھ کر باقی صدقہ کرو۔ (بخاری شریف) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اپنی بیماری میں سب مال صدقہ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں بھی صرف ایک تہائی کی اجازت دی۔ (الترمذی) کسب معاش کو "اللہ کے فضل کی تلاش" قرار دیا گیا۔ (الجمعہ) مال کو "خیر" کہا اور حلال رزق کے لیے کوشش کرنے والے کا درجہ مجاہد فی سبیل اللہ کے برابر بیان فرمایا۔ (المزمل)

"تزکیہ" کی مخصوص اور روایتی دنیا میں یہ خیالات اور اعمال بالکل نئے تھے!

نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد وقتال کو دین کی بلند ترین چوٹی قرار دیا۔ " **ذروۃ سنامہ الجھاد**"۔ (الترمذی) اپنی اس بے تابانہ خواہش کا اظہار فرمایا کہ مجھے پسند ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں۔ (مسلم شریف) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں، آپ نے اپنی امت کو وہ "آتشیں شریعت" (کتابِ استثناء) عطا فرمائی (ایسی شریعت جس میں جہاد وقتال کے احکام بھی شامل ہوں) جس میں رہبانیت، زندگی سے فرار، نیکی اور نیکی کے داعیوں کا معاشرے سے کنارہ کش ہونا اور فساق وفجار کے ہاتھوں میں مملکت اور سلطنت کی زمام کار چھوڑ دینا، ہمیشہ کیلئے مسدود کر دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما گئے کہ **الجھاد ماض الی یوم القیامۃ**۔ یعنی جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ (ابوداؤد) آپؐ کی امت کی زندگی کا سامان بھی اور سامان رزق بھی جہاد ہی میں رکھا گیا۔ **وجعل رزقی تحت ظل رمحی**۔ یعنی میرا رزق نیزے کے سائے تلے رکھا گیا۔ (بخاری شریف) جہاد ومزاحمت کا یہ جذبہ باقی نہ رہے تو امتیں تر نوالہ بن جاتی ہیں۔

معاملاتِ زندگی کا کون سا پہلو ہے جو پاکیزگی کی تربیت سے محروم رہ گیا ہے۔ درحقیقت یہ وہ تکمیلی تعلیم تھی جو نبی آخر الزماں کے حوالے سے انسانیت کو عطا کر کے، آسمانی رہنمائی کا باب بند کر دیا گیا۔

(جاری ہے)

☆☆☆

ام ایمان

رمضان الکریم مہمانِ کریم

وقت ایک بڑی نعمت ہے۔ ایک ایسی نعمت جو ہر انسان کو برابر دی گئی ہے۔ ہر ایک کا دن چوبیس گھنٹے کا ہی ہوتا ہے، نہ چھوٹا نہ بڑا...... ہاں ہماری کاہلی،تساہل اور ضائع کرنے کی عادت سے ہم خود اس کو چھوٹا کر لیتے ہیں۔ یا سمجھ داری، مستقل مزاجی اور وقت کے منظم استعمال سے بڑا کر لیتے ہیں۔

یوں تو وقت کا استعمال ساری زندگی بڑا اہم ہے لیکن رمضان کے مہینے میں اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ بزرگ دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ انہیں رمضان کے مہینے تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ وہ ان قیمتی لمحات سے مستفید ہوسکیں۔ بہر حال موت کا وقت معین ہے۔ یہ کونسا لمحہ ہے،کوئی نہیں جانتا۔لہٰذا ہم سب کی یہ ہی آرزو ہونی چاہیے کہ رمضان کی برکتوں والی گھڑیاں ہمیں حاصل ہو جائیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرمایا کرتے تھے ''تم ہر لمحہ یہ سوچتے رہو کہ خدا سے کتنے قریب ہوئے شیطان سے کتنے دور ہوئے، جنت سے کتنے قریب ہوئے اور دوزخ سے کتنے دور ہوئے۔''

لیجیے مبارکباد ہو کہ وہ مہینہ ہمیں میسر ہے کہ جب شیطان باندھ دیا جاتا ہے، جنت کے راستے آسان اور دوزخ کے مشکل ہو جاتے ہیں۔ جنت سے قربت اور دوزخ سے نجات کا موقع ملتا ہے۔ ایک مرتبہ رمضان آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم پر ایک ایسا بابرکت مہینہ سایہ فگن ہوا جس کے روزے اللہ نے تم پر فرض کیے ہیں۔ اس میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطان قید کر دیئے جاتے ہیں۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ جو شخص اس کی خیر سے محروم رہا بس وہ محروم ہی رہ گیا۔'' (احمد، نسائی، بیہقی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''جس شخص نے اللہ پر ایمان اور اس سے اجر کی امید رکھتے ہوئے رمضان کے روزے رکھے، اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں

گے۔'' (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

رمضان کی مبارک ساعتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ رمضان کے استقبال کی تیاری کی جائے۔ یہ محترم اور مبارک مہمان ہمارے لیے گناہوں سے مغفرت، اللہ کی رحمت کے حصول اور دوزخ سے نجات کی خوشخبری لے کر آتا ہے۔ اس کے لئے وہ سب کچھ معلوم کرنا ضروری ہے جو ان متبرک گھڑیوں کو ہمارے لیے سہل بنا دے۔ مثلاً کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے کون سی باتیں رمضان کی عظیم نعمت کے اجر کو ہمارے لیے بڑھا دیتی ہیں۔ اور کون سی پیاس اور بھوک کی پابندی کو محض مشقت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

بہتر ہے کہ رمضان المبارک آنے سے پہلے رمضان کے احکام و شرائط اور آداب کو از سر نو مطالعہ کیا جائے، ذہن میں تازہ کیا جائے پچھلے سال جو کچھ سیکھا تھا اس میں اضافے کا ارادہ ہو۔ ڈائری میں وہ نکات ترتیب دے دیئے جائیں جن کو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نکات کسی طرح ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک اپنی ذات کے حوالے سے، دوسرے اپنے اہل خانہ اور بچوں کی تربیت کے حوالے سے، تیسرے اپنے ہمسائیوں، احباب اور رشتے داروں کے حوالے سے۔

پھر اس میں بھی کئی زاویے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اپنی ذات کے حوالے سے دن کے اوقات کی ترتیب بنانی چاہیے جس طرح ٹائم ٹیبل ہوتا ہے۔ پھر پانی اچھی عادتوں میں کیا مزید اضافہ کرنا چاہیے اور بری عاتوں میں سے کن کن سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے، اپنی صلاحیتیوں، قابلیتوں اور مال کو جس طرح پچھلے سال اللہ کی رضا کے لئے استعمال کیا تھا اب کے اس سے کہیں زیادہ کی کوشش کرنی چاہیے۔ کتنی دعائیں اور کتنی سورتوں کی یاد دہانی یعنی حفظ کرنا ہے، یہ پہلے سے سوچ لینا چاہیے بے حد فائدہ مند ہوتا ہے۔

رمضان سے پہلے جس طرح گھروں کی صفائیاں کی جاتی ہیں اسی طرح موت کے بعد کے گھر یعنی قبر کی صفائی کا دھیان رکھنا ہے۔ اس کے جالے صاف کرنے ہیں۔ اس کی کشادگی اور نرم بچھونے کے لئے تیاریاں کرنی ہیں۔ ٹھنڈک اور روشنی کا انتظام کرنا ہے۔ قبر کی وحشت کے لئے مونس و غم خوار کو تیار کرنا ہے، جو قبر کی سیاہی، اندھیرے پن اور تنہائی کو دور کرنے اور اللہ کی مہربانی اور رحمت کو واجب کرنے کا سبب بنے۔

لیکن ہر تیاری سے بھی پہلے جو اہم ترین کام کرنا ہے وہ اپنی نیت کو خالص کرنا ہے۔ بے شک اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ جو چھوٹی نیکی کو بڑا اور بہت بڑا بنا دیتی ہے اور بڑی نیکی کو چھوٹا اور حقیر بنا دیتی ہے۔ نیت خالص ہو تو ایمان کی قوت میں شدت آتی ہے جو ہر مشکل مرحلے کو ہنستے کھیلتے طے کر ڈالتی ہے۔ نیت کے خلوص کے لئے سب بڑی حقیقت ہے اور جس کے آگے بڑے سے بڑا طاقتور بادشاہ بھی ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا ہر عمل سے پہلے موت کو یاد کر کے نیت اور ارادے کو صرف اللہ کے لیے خالص کر لیں۔

اپنی ڈائری پر ٹائم ٹیبل لکھنے سے پہلے سب سے اوپر اس جملے کو تحریر کر لیں تا کہ جب کبھی ٹائم ٹیبل پڑھیں تو عزم اور ارادے کی یاددہانی ہو جائے۔ گھروں میں افطار اور سحری کے لئے بہت زیادہ تیاریاں کی جاتی ہیں۔ دسترخوان کو سجانے اور ہر ایک کی پسند کی چیز مہیا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کو اگر کچھ مختصر کر لیا جائے تو وقت اور پیسے دونوں کی بچت ہو گی اور یہ دونوں ہی اللہ کی رضا کیلئے زیادہ استعمال کیے جاسکیں گے۔

افطاری میں گھر والوں کی پسند کا خیال رکھیں لیکن روز گھر میں سے ایک شخص کی پسند کی چیز بنالیں۔ اسی طرح باری باری ہر ایک کی پسند کا پکوان پکایا جاسکتا ہے۔ گھر کے لوگوں کو اپنے چھوٹے موٹے کاموں میں لگائیں اوراس کے لئے اجر کا یقین دلائیں۔ خواہ وہ کام ملازموں کے کرنے کا ہی کیوں نہ ہو مثلاً دسترخوان سے اٹھتے ہوئے برتن باورچی خانے میں رکھنا، دسترخوان جھاڑنا، فرج کی بوتلوں میں پانی بھر کر رکھنا وغیرہ۔

رمضان کے لیے ایک ایک لمحے کا اجر ہے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ کتنا دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بنی آدم کا ہر عمل اس کے لئے ہے لیکن روزہ بندے کی طرف سے خاص میرے لیے ایک تحفہ ہے، اور میں ہی (جس طرح چاہوں گا) اس کا اجر وثواب دوں گا، میرا بندہ میری رضا کے لئے اپنی خواہش نفس اور اپنا کھانا پینا چھوڑتا ہے (پس میں خود ہی اپنی مرضی کے مطابق اسکی اس قربانی اور نفس کشی کا صلہ دوں گا) روزہ دار کے لئے مسرتیں ہیں۔ ایک افطار کے اور شرف باریابی کے وقت اور قسم ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی بہتر ہے (یعنی انسانوں کے لیے مشک کی خوشبو جتنی

اچھی اور جتنی پیاری ہے اللہ کے ہاں روزہ دار کی منہ کی بو اس سے بھی اچھی ہے) اور روزہ دنیا میں شیطان ونفس کے حملوں سے بچاؤ کے لئے اور آخرت میں آتشِ دوزخ سے حفاظت کے لئے ڈھال ہے۔ ''اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیے کہ بیہودہ اور فحش باتیں نہ بولے اور شور وشغف نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا اس سے گالی گلوچ یا جھگڑا انٹنا کرے تو وہ کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔'' (صحیح بخاری ومسلم)

خواتین کو باتیں کرنے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ گپ شپ کرتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب غیبت جھوٹ بہتان طرازی اور الزام تراشی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ اگر فون بھی کریں تو کام کی بات کی جائے یا کسی اچھی بات کی یاد دہانی کرا دی جائے۔ مومن کی خاموشی بھی عبادت ہوتی ہے۔

افطار اور سحر کے اوقات میں دعاؤں کی دہرائی کرائی جائے۔ سحری میں کچھ پہلے اٹھ کر تہجد ضرور ادا کی جائے۔ اگر عشاء کے ساتھ وتر چھوڑ کر تہجد کے وقت ادا کیے جائیں تو درمیان کا وقت عبادت شمار ہوتا ہے اور قیام اللیل میں لکھا جاتا ہے اگرچہ سو کر گزارا ہو۔ لیکن اس میں انتہائی احتیاط کے ساتھ سحری میں وقت نکال کر اٹھنے کا التزام رکھنا چاہیے۔

رمضان کی معراج شب قدر ہے جس کا حصول ہر روزہ دار کی آرزو ہوتی ہے۔ لیکن اس آرزو کے لئے ضروری ہے کہ پورے ماہ رمضان اپنے عمل اور فکر کا دھیان رکھا جائے۔ اللہ کی رضا اور ناراضگی کو ہر لمحہ پیش نظر رکھا جائے۔ احتساب کے بندھن کو نفس کی بندش کے لیے استعمال کیا جائے تو یقیناً شب قدر کا حصول ممکن ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان فرماتی ہیں کہ جب رمضان کی آخری دس تاریخیں آتی تھیں تو رسول اللہ ﷺ کمر بستہ ہو جاتے تھے، رات رات بھر جاگتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے (متفق علیہ)

رمضان المبارک میں نیکی کی جو فضا اور تربیت کا نظام میسر آتا ہے۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ماہ مبارک میں آنے والے پورے سال کی منصوبہ بندی کر لینا بھی ممکن ہے یعنی اپنے اور اپنے خاندان کے لئے آنے والے سال میں کیا کیا سعادتیں حاصل کرنی ہیں اور کون کون سی چیزیں چھوڑ دینی ہیں۔ رشتے داروں اور ہمسایوں کے حقوق کو مزید کس طرح بہتر طور پر

ادا کرنا ہے۔اپنے علم کو کیسے بڑھانا ہے۔قرآن کو دل میں مزید کس طرح محفوظ کرنا ہے۔ کون سی کتابیں پڑھنی ہیں۔کون سے اعمال صدقہ جاریہ کے طور پر شروع کرنے ہیں۔خدمت کے کون سے مواقع حاصل کرنے ہیں۔

روزے کا اصل مقصد تقویٰ کا حصول ہے۔تقویٰ نام ہے خواہشات اور جذبات پر قابو پانے کا اور ضبطِ نفس کا۔ رمضان کے آخری عشرے میں ہم عموماً روزے کے بجائے عید کے بارے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔عید کی تیاری کرنی چاہیے لیکن اعتدال کے ساتھ......رمضان کی بابرکت ساعتوں میں دھیان رکھیے کہ بازاروں میں لباس اور چوڑیوں کے لئے وقت ضائع نہ ہو۔اس کے لئے رمضان سے قبل بیشتر تیاری کرلیں تو بہت اچھا رہے گا۔عید کی چاندرات اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر فخر کا اظہار فرماتے ہیں۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جب لیلۃ القدر ہوتی ہے تو جبرئیلؑ ملائیکہ کے ایک جھرمٹ میں اترتے ہیں اور اس بندے کے لیے دعا کرتے ہیں جو اس وقت کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا اللہ عز وجل کا ذکر کر رہا ہو (یعنی جاگ رہا ہو اور عبادت کر رہا ہو) پھر جب عید الفطر کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنے ملائیکہ کے سامنے فخر کرتا ہے اور انہیں مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اے میرے فرشتو! اس مزدور کی جزا کیا ہے جس نے اپنے ذمے کا کام پورا کر دیا۔فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! اس کی جزا یہ ہے کہ اس کی مزدوری اسے پوری پوری دے دی جائے۔ اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ اے میرے ملائکہ! میرے ان بندوں اور بندیوں نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا جو میں نے ان پر عائد کیا تھا۔ پھر اب یہ گھروں سے (عید کی نماز ادا کرنے اور) مجھ سے گڑگڑا کر مانگنے کے لئے نکلے ہیں۔ اور قسم ہے میری عزت اور میرے جلال کی، اور میرے کرم اور میری بلند مرتبگی کی اور میری بلند مقامی کی کہ میں ان کی دعائیں ضرور قبول کروں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: جاؤ میں نے تمہیں معاف کر دیا تمہاری برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دیا۔رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر وہ اس حالت میں پلٹتے ہیں کہ انہیں معاف کر دیا جاتا ہے۔(بیہقی)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو رمضان سے فیض یاب ہونے اور اللہ کے اپنے بندے بننے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

☆☆☆

نعت

ذکر احمدؐ سے مصیبت میرے غم کی جائے گی
دل کی دنیا نور کے سانچے میں ڈھلتی جائے گی

روشنی کے قحط سے جب دل سیہ ہوجائیں گے
سیرتِ نور محمدؐ ہی انہیں چمکائے گی

عمر کا پچھلا پہر ہے دن کی ڈھلتی دھوپ ہے
کب مجھے آقاؐ حضوری کی صدا دی جائے گی

کلفتیں تو زندگی کی قبر تک جائیں گی ساتھ
حسرتِ دیدار لیکن کیا کبھی نہ جائے گی

بے عمل ، بے زر ہوں ، بے پر ہوں ، بہت ناچار ہوں
کیا مری فریادِ غم یارب سنی بھی جائے گی

ہے قدم بوسی کی حسرت کیوں نہ سر کے بل چلوں
حالتِ جاں حاضری کے بعد دیکھی جائے گی

لگ رہا ہے آ گئے ہیں دن حضوری کے قریب
یاسمیںؔ مہکی ہوئی روضہ پہ دیکھی جائے گی

(نجمہ یاسمین یوسف)

عید مبارک

شکر گزاری کا یہ دن ہے
عجز و نیاز کا موقع ہے
شکر گزاری اس نعمت کی
کہتے ہیں ایمان جسے
شکر گزاری اس تحفے کی
کہتے ہیں قرآن جسے
شکر گزاری اس توفیق کی
جس نے نیکی کروائی
شکر گزاری ان خوشیوں کی
جو بھی حصے میں آئی
اس سے عجز و نیاز کا یہ دن
اس کو خوش کرتے گزرتے
ملتے جلتے ، لیتے دیتے
امن و اخوت سے گزرے
بغض و عناد سے یا اسراف سے
بخل سے یا بیزاری سے
آپس کی ناچاقی سے یا ناشکری کی
عادت سے
خالص خوشیوں کے اس دن کو
آلودہ مت ہونے دیجے
اپنے لفظ و عمل سے کسی کو
رنجیدہ مت ہونے دیجے

(شمیم فاطمہ)

سن ارض وسما کے رکھوالے

(مرثیہ معصومینِ شام)

وہ پھول بہت ہی چنچل تھے
جو پہلے اپنے کھلنے سے
یوں خاک میں مل کر خاک ہوئے
برباد ہوئے کس کے ہیں؟
یہ غنچے کن کن شاخوں کے
جو ہر دم لہکے جاتے تھے
یا خاک میں ایسے چاند چھپے
افلاک کا چاند بھی روتا ہے
سب تارے شب کے کہتے ہیں!
یہ دیپ تھے کس کے آنگن کے
کس آنکھ میں کھٹکے جاتے تھے؟
کس دل کا کانٹا بنتے تھے!
شاہانِ زمیں فرعونِ زماں
اب کتنا لہو تم چاٹو گے؟
یہ پیاس تو بجھنے والی نہیں
یہ مٹنے والی بھوک کہاں؟
سنتے ہیں غلامی انساں کو
حیوان سے بدتر کرتی ہے
دیکھا ہے دیس میں عربوں کے
کیا پتی پتی مسلی ہے
وہ شیرِ خدا کی دخترؓ کے
روضے پہ چڑھ کے آتے ہیں
دیکھو تو کیسے ہوتا گیا

پامال مزارِ سیفؓ خدا
یہ کن کے خونیں ہاتھوں سے
حلقوم پہ ننھے اصغر کے
اب تیر چلائے جاتے ہیں
اور بھالے مارے جاتے ہیں
گونجی ہے فضا یوں نوحوں سے
ان چیخوں سے ان آہوں سے
اک حشر کا عالم برپا ہے
معصوم لہو جو بہتا ہے
سن ارض وسما کے رکھوالے!
ان ننھی کلیوں کے نالے
یہ ہچکی مسلے پھولوں کی
ان خاک نشیں روحوں کی صدا
دھرتی کو ہلائے جاتی ہے
فریاد سوالی بنتی ہے
یوں شاہی لباسوں میں کب تک
سفاک غلامی پنپے گی
انسان کی فطری آزادی
زنجیر میں کس کس جکڑے گی
مخلوق یہ کیسی اجڑی ہے!
کیا پتی پتی بکھری ہے!

(اسما صدیقہ۔ کراچی)

بتاؤ تم میرا ساتھ دو گے؟

’’آپا! آپ کے پاس آ کر دل کو اتنا سکون ملتا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی، وقت جو اپنے گھر میں کاٹے نہیں کٹتا یہاں آ کر کیسے پر لگا کر اڑ جاتا ہے پتہ ہی نہیں چلتا۔ آپ کے ہاں ماحول بھی سکینت سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے اللہ نے آپ کے گھر کے چپے چپے کو نے کونے میں اینٹ بجری سیمنٹ کی بجائے سکینت اوراطمینان شامل کیا ہے۔‘‘نویرہ آنکھیں بند کیے جذب کے عالم میں اپنے جذبات واحساسات سے آ گاہ کر رہی تھی۔نویرہ جدیدیت سے پلٹا کھا کے اسلام کی طرف لوٹی تھی اس لیے وہ کسی بات اور کسی معاملہ کو سرسری نہیں لیتی تھی ہر چیز کی تہہ میں اترنا اغراض ومقاصد پر غور کرنا اس کی سرشت میں تھا۔

’’آمنہ مختار‘‘ المعروف آپا جی اس کی ہی نہیں درجنوں بلکہ سینکڑوں دین سے دور یا ناواقف خواتین کی محسنہ تھیں۔ اپنے درس اور گفتگو سے وہ ایسے دلپذیر انداز میں مقصد زندگی سے آگاہ کرتیں کہ آنے والی کی زمین اگر نرم اور زرخیز ہوتی تو پہلی ملاقات میں ہی حلقہ اثر میں شامل ہو جاتی۔ بہت سی ذہنی مریضوں نے اگر ان کے حلقہ ہائے دروس سے شفا پائی تو جسمانی نا قابل علاج امراض سے شفایاب ہونے والیوں کی بھی کمی نہ تھی۔ بوٹا سا قد، سنہری دمکتا رنگ تیکھے نین نقوش رکھنے والی آپا جی کی زندگی میں خاندان، محلے اور شہر بھر کی خواتین کی بے پناہ محبتیں شامل تھیں۔ ان کی مسکراہٹ پر صدقے واری جانے والیوں کی کمی نہ تھی۔ مقدر کے لکھے غم جب ان تک پہنچے تو ان کے آنسو پونچھنے کے لئے سینکڑوں ہاتھ ہوتے۔ ان کی دلجوئی کے لئے آنے والیوں کو باری کا انتظار کرنا پڑتا۔

بہرحال یہ بات طے تھی کہ ان کی زندگی سادہ ان کے معمولات سنت کے عین مطابق اور انکی گفتگو اللہ کے قریب کرنے والی ہوتی۔ سات سمندر پار جا کر بھی لوگ ان کو نہ بھولتے، وہ ہر ایک سے امیری غریبی یا رینکنگ کے بغیر یکساں ملتیں۔ محبتوں اور چاہتوں کے پھول نچھاور کرتیں۔ وسیع مطالعہ اور شب زندہ دار تھیں۔ جتنا اپنی عبادتوں اور ریاضتوں کو مخفی رکھتیں اللہ

رب العزت اتنا ہی انہیں خوشبو کی طرح عام کر دیتا۔ وہ جتنا عاجزی اختیار کرتیں اللہ برتر و بالا انکی عظمت میں اتنا ہی اضافہ کر دیتا۔ بشری کمزوریاں تو ہر ایک میں ہوتی ہیں ان میں بھی تھیں اور یقیناً تھیں لیکن ان کے مہربان رب نے ان کی خامیوں کی صرف پردہ پوشی ہی نہیں کی بلکہ ان کی کمیوں کوتاہیوں کو بھی ہنر بنا کر پیش کیا۔

اکثر وہ مانگتے ہوئے رو پڑتیں، مالک میری ایسی کون سی ادا تجھے پسند آ گئی ہے اور یہ کہتے ہی کھٹ سے دل میں ایک خیال آتا او رہم مانگنے والوں کو ایسے ہی نوازا کرتے ہیں۔

ان کے حلقہ احباب میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ برتن دھونے والی جھاڑو و پوچا کرنے والی ماسیاں بھی اور بڑے بڑے اداروں کی ہیڈ یا چیئر پرسن بھی۔ انہیں سب ہی بے حد محبوب تھیں۔ نویرہ بھی انہی میں سے ایک تھی۔ مقامی کالج میں کرکٹ ٹیم کی کپتان اور مقامی ایف ایم پر اینکر پرسن بھی۔ دنیا داری کے راستوں پر بھاگتے دوڑتے ایسی ٹھوکر نصیب نے ماری کہ بلبلاتی ہوئی اپنی دوست کے ساتھ آپا جی کے در پر پہنچی۔ پہلی ملاقات میں گھائل ہوئی دوسری ملاقات میں آئی تو کتاب الٰہی ہاتھ میں تھی۔ آپا جی نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس کے لئے دعا گو ہوئیں اور کتاب کی پہلی آیت سے ترجمہ شروع کر دیا۔ اسے آپا جی کے ہاں آئے تیسرا یا چوتھا مہینہ تھا۔ اگر کوئی چار پانچ ماہ پہلے والی نویرہ کو اور اس نویرہ کو دیکھ لیتا تو کبھی پہچان نہ پاتا۔ صحیح معنوں میں اس نے اپنا ظاہری چولا بھی اتار پھنکا تھا ور باطن کی درستگی کے لئے بھی کوشاں تھی۔ گھر میں سب ذمہ دار افراد تھے، وہ طالبہ تھی۔ گھریلو کام کاج اور ذمہ داریوں سے آزاد اس لیے ترجمہ کی چار چھ آیات پڑھنے کے بعد گھنٹہ بھر ضرور رکتی۔ بس آنے والیوں اور آپا جی کی گفتگو کو سنتی۔ بڑی دلسوزی سے مثالیں دے دے کر وہ زندگی کی بے ثباتی کا احساس دلاتیں۔ آتے ہوئے ہوسکتا ہے خواتین کے ساتھ پریشانیوں اور مسائل کی گٹھڑی ہو، جاتے ہوئے ہلکی پھلکی میں اُڈی اُڈی جاواں ہوا دے نال، کی طرز پر جاتی۔

آج بھی نویرہ کچھ ایسی ہی کیفیت میں آئی تھی اور آتے ہی اظہار بھی کر دیا، ترجمہ تو آپا جی نے پڑھا دیا لیکن اس کے بعد گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر تو نویرہ دیکھتی رہی اس کی آپا جی سے مختصر سی تعلق داری میں یہ فیز (Phase) پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ بالآخر نویرہ

نے خود ہی لب کشائی کی

’’آپا جی! آج تو میں آپ کے پاس بطور خاص باتیں سننے کے لئے آئی ہوں کیا آپ وظیفہ کرنے میں مصروف ہیں؟‘‘

’’نہیں رانی! وظیفہ تو نہیں کرتی لیکن میں آج تم سے بات بھی نہیں کروں گی۔‘‘ انہوں نے دلگیر لہجے میں کہا۔

’’وہ کیوں آپا جی؟ کیا مجھ سے غلطی ہوگئی؟‘‘ نویرہ بے تابی بولی۔

آپا جی کے چہرے پر شدت برداشت سے دراڑیں پڑ گئیں۔ ان کے ماتھے پر چھوٹے چھوٹے قطرے چمکنے لگے۔ ان کا چہرہ ریزہ ریزہ ہوا۔ آنکھوں کے کونے آنسو ٹپک پڑے۔

’’آپا جی! آپ ٹھیک تو ہیں، کیا ہوا آپکو؟‘‘ وہ گھبرا کر بولی۔

’’مجھے...... کچھ نہیں ہوا۔ ان کے آنسوؤں کی قطار بکھرنے لگی۔ ان کے دل کی دھڑکن اور دھک دھک کی آواز نویرہ کو سنائی دے رہی تھی۔ نویرہ نے ان کی یہ کیفیت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے جھٹ سے پانی کا گلاس تھمایا۔ پانی پی کر گلاس ایک طرف رکھا اور اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے وہ بولیں۔

’’باقی اقوام کا تو میں کہہ نہیں سکتی لیکن جب امت محمد یہ، صرف اور صرف سننے کی ’’ذہنی عیاشی‘‘ میں مبتلا ہو جائے۔ اچھے درس اور لیکچر سننے کا چسکہ لگ جائے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ آیت سے منہ موڑ لیا جائے۔ نیکی کی باتیں سن کر اس خزانے پر سانپ بن کر بیٹھ رہیں، دوسروں کو برائی کرتا دیکھیں اور خاموش رہیں تو پھر بتاؤ اسی ذہنی عیاشی پر اللہ ہم سے کیسے راضی ہوگا۔ ہم کنواں بن کر خوش ہوتے ہیں کہ پیاسا ہمارے پاس آئے ہمارے سینے کے کنویں میں سینکڑوں سی ڈیز کے دروس جمع ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ امت محمد یہ کو کنواں نہیں بادل بن کر برسنا ہے۔ ہر طلب گار تک بھی سنی باتیں پہنچانا ہیں اور اس تک بھی جو طلب گار نہیں۔ ہم سب ایک پروگرام کے بعد اگلے پروگرام کا ایک درس کے بعد دوسرے درس کا انتظار شروع کرتے ہیں۔ مجھے بتاؤ میں ان حالات میں کیا کروں۔ ہم سب اسی ذہنی عیاشی میں مبتلا ہوگئے ہیں جس سے آقائے نامدارؐ خبردار کر گئے تھے۔ اور کوئی تعاون کرے یا نہ کرے تم اور میں تو بہت کچھ عملی طور پر کر سکتے ہیں! بتاؤ میرا ساتھ دو گی؟‘‘

اب پانی کے قطرے نویرہ کی آنکھوں سے بہہ
رہے تھے۔ آنسوؤں کی نمی اس کے لہجے میں تھی۔
لرزتے ہاتھوں سے اس نے آپا جی کے ہاتھ کو بوسہ
دے کر اپنے ہاتھ میں لیا اور پوچھا ''ضرور......آپ
مجھے بتایئے مجھے کیا کرنا ہے؟''

☆☆☆

صبیحہ نبوت

یادوں کی چادر

ایک دن آمنہ نے بڑے رازدارانہ انداز سے دادی سے کہا۔

''دادی جان کیا آپ کو پتہ ہے ابو اب ڈیفنس میں گھر لینے والے ہیں۔''

دادی نے اخبار پڑھتے ہوئے عینک کے نیچے سے پوچھا۔''ہیں کیا کہہ رہی ہو لیکن تم سے کس نے کہا۔''

''ابو ایک دن ویسے ہی باتیں کررہے تھے۔''

''لیکن انھوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا ......'' وہ پریشان ہو کر بولیں۔

''آپ منع جو کرتیں اسی لیے نہیں بتایا ہوگا۔''

''اچھا یہ بات ہے آنے دو آج ابو کو'' دادی نے غصے سے کہا۔

''کیا آپ انھیں ڈانٹیں گی۔'' آمنہ پریشان ہو کر بولی۔

''بس تم دیکھتی جاؤ اب کیا ہوگا سارے فیصلے خود ہی کرلیتے ہیں۔''

''نہیں......دادی پلیز ابو کو کچھ مت کہیے گا۔''

''کیوں، کیوں نہ کہوں۔ ہم اس گھر سے کہیں نہیں جائیں گے۔''

آمنہ نے معصومیت سے کہا۔''ہوسکتا ہے آج آپ کو بتا دیں۔'' یوں اس نے دادی کو تسلی دی، ابو کی طرف داری کی اور بات ٹل گئی۔

شام کو ابو آئے خاموش خاموش سے۔ رات کے کھانے پر سب اکٹھے ہوئے۔ تینوں نے ایک دوسرے کو کن اکھیوں سے دیکھا ...... پہل کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ سب کھانے میں مصروف رہے لیکن آمنہ پریشان تھی کہ کہیں دادی کی ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ جب اس سے رہا نہ گیا تو بولی۔''ابو دادی کو ڈیفنس والے گھر کی بات بتا دیں نا۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں، پہلے کھانا تو کھا لو......'' ابو نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا...... لیکن کھانے کے بعد ابو خاموشی سے کھسک گئے اور دونوں انھیں دیکھتی رہ گئیں۔

اس عرصے میں دادی نے محسوس کیا کہ ارشد کچھ پریشان ہیں اور یہ پریشانی ان سے کیسے برداشت ہوتی ......کھانے کے بعد وہ ارشد کے کمرے میں خود ہی چلی گئیں اور پریشانی کی وجہ پوچھ ہی لی۔

''بھئی ارشد یہ میں ڈیفنس کی خبریں کیا سن رہی ہوں۔ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔'' ارشد امی کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔

''دراصل امی میرے کاروبار میں نقصان ہو گیا ہے۔ اس لیے پریشان ہوں......لیکن کاروبار کا ڈیفنس سے کیا تعلق ...... امی نے ارشد کو مزید ٹٹولا......'' امی میں سوچ رہا تھا یہ گھر بہت بڑا ہے اگر اس کو بیچ کر ہم چھوٹا گھر کہیں اچھی جگہ لے لیں تو کاروبار کا نقصان بھی پورا ہو جائے گا...... ویسے بھی دیکھیں یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں......''

''لیکن بیٹا کاروبار کے نقصان کی خاطر گھر بیچ دیں؟ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر سادگی کو شعار بنایا جائے تو یہ سب کیوں ہو۔'' ماں نے ارشد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا جائیداد بنائی جاتی ہے بیچی نہیں جاتی۔''

''لیکن امی۔ آپ خود دیکھیں یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں رہی......دیکھئے باہر ہر طرف کوڑے کے ڈھیر ہیں......لوگوں نے گیراج میں دکانیں بنالی ہیں۔ ٹریفک کتنی ہے ایک ایک گھنٹہ جام رہتی ہے۔ بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہمیں یہاں سے نکلنا تو ہے آج نہیں تو کل۔'' امی سوچ میں پڑ گئیں۔ ارشد نے امی کی پریشانی بھانپ لی...... بولے۔

''لیکن امی آپ پریشان نہ ہوں یہ سب اسی وقت ہوگا جب آپ چاہیں گی۔'' یہ سب کہہ کر ارشد تو چلے گئے۔ لیکن امی سوچ میں پڑی رہیں۔

ارشد نے اپنے علاقے کی اتنی برائی کر دی......؟ لیکن وہ پریشان تو ہے اب میں اس کو پریشان بھی تو نہیں دیکھ سکتی...... یہ گھر کیا میں اس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔ وہی تو میری زندگی کا محور ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر لوں گی۔

بس ارشد کی پریشانی دور ہو جائے۔ وہ جو کہے گا وہی کر لوں گی لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی ...... چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اپنا خیال آیا...... یہ گھر جہاں میں نے زندگی کے چالیس سال گزارے ہیں اس میں تو میرا ماضی ہے۔ وہ یادیں جو میری زندگی کا پل پل حصہ ہیں۔ پہلی دفعہ جب میں

نے یہاں قدم رکھا تھا تو دل نہیں لگا تھا جب انسان رہتا ہے اور اسے اپنا گھر سمجھتا ہے تو دل بھی لگ جاتا ہے۔ یہاں میری زندگی کا خوشگوار دور ہے۔ اسے میں کیسے چھوڑ وں گی ......؟ یہ سوچ کر انھوں نے ادھر ادھر دیکھا۔لیکن مجھے جانا ہوگا ارشد کی خاطر اس کے لیے بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا ہے...... کیونکہ وہ پریشان ہے بس اللہ تعالٰی کو یہی منظور ہے۔ اسی میں سب کی بھلائی ہو گی ...... یہ سوچ کر دل کو تسلی دی ......خیالات کو جھٹکا ...... ویسے بھی گھر تو انسانوں سے بنتے ہیں ...... در و دیوار سے نہیں ...... وہ جگہ جہاں سب کی خوشیاں ایک ہوں ......بچوں کے قہقہے ہوں جہاں محبتوں کے چراغ روشن ہوں۔ وہی تو اصلی گھر ہوتے ہیں ......غیر مانوس اور اجنبی ماحول بھی اپنا لگنے لگتا ہے......تو کیا یہ گھر میں آسانی سے چھوڑ دوں گی...... کیا ڈیفنس میں میرا دل لگ جائے گا؟ ہاں ...... کیوں نہیں انھوں نے اپنے کو پھر سمجھایا اور حالات سے سمجھوتا کرلیا۔

پھر وہ دن بھی آ گیا...... جب اس گلی اور اس گھر کو انھوں نے الوداع کہا......اور اپنا گھر ڈیفنس میں بسا لیا۔

پہلی رات بڑی مشکل سے کروٹیں بدلتے گزاری ......سوچا نئی جگہ ہے دل لگنے میں وقت تو لگے گا۔آہستہ آہستہ عادت پڑ جائے گی ......یوں فجر کی اذان ہوگئی۔ نماز پڑھی ......تلاوت کی ......دل لگنے کی دعا کی ...... آنسو پونچھے اور باہر نکلیں ......گھر کے چاروں طرف چکر لگایا۔ ادھر ادھر دیکھا بڑا گیٹ کھول کر باہر جھانکا ......دل کو دھچکا سا لگا...... یہ تو وہ جگہ نہیں ہے۔ ہماری گلی تو بڑی کشادہ تھی...... بارونق تھی۔ اس وقت بچے اسکول جانے کے لیے بستے گلے میں ڈالے گاڑیوں میں بیٹھ رہے ہوتے تھے اور مائیں ان پر آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر پھونک رہی ہوتی تھیں۔ اس وقت حجر شجر سب محو دعا ہوتے تھے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے سارا ماحول معطر ہوتا تھا...... گھروں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی کیاریاں بنی ہوئی تھیں ان میں موتیے، چمبیلی اور مروے کے خوشبودار درخت لگے تھے ......گھروں کے بڑے بڑے لان تھے۔ان میں یوکلپٹس کے درخت تھے جن کی ٹہنیاں ہوا سے سرسراتیں تو کسی لوری کا احساس ہوتا ...... بوگن بیلیا سے ڈھکے ہوئے برآمدے جن کے رنگ برنگے پھول اپنی بہار الگ دکھاتے تھے اس گلی میں بہت سے لوگ آباد تھے......وہ سب ایک ہی خاندان کے تھے ......کسی بھی گھر میں

شادی ہوتی تو پوری گلی کو رنگ برنگی روشنیوں سے سجایا جاتا تھا وہاں ہر ہفتے ایک گھر میں ون ڈش پارٹی ہوتی۔ یوں سب کی خوشیاں اور غم ایک ہی تھے۔ لوگ ان مکینوں پر رشک کرتے تھے۔

گلی کے پچھواڑے مسجد تھی جہاں سے پانچوں وقت اذان کی آواز آتی ...... ہر جمعہ کو صبح میلاد ہوتا تو نعتوں کی مسحور کن آوازیں کانوں میں رس گھولتی تھیں ...... وہ سب تو بڑا اچھا تھا...... اس سے دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی تھی ...... سورج نکلنے کے بعد سودے والوں کی آوازیں آنے لگتیں۔ سبزی والے نے ایک ٹھکانہ بنالیا تھا۔ ایک گھر کے آگے درخت کے سائے میں کھڑا ہو جاتا اور خواتین سبزی لینے نکل آتیں ...... سبزی چھانٹی جاتی ...... بھاؤ تاؤ ہوتا...... ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے گھریلو اور خاندانی معاملات معلوم کیے جاتے تو کبھی سیاست اور مہنگائی کی پریشانی پر تبصرے ہوتے ......سبزی کبھی ادھار بھی لے لی جاتی کیونکہ سبزی والے کو پتہ تھا انھیں کہاں جانا ہے ...... رات کو لوڈ شیڈنگ میں بچے بوڑھے سب باہر نکل آتے ...... اپنے اپنے ساتھی چن لیتے اور باتوں کے ساتھ ساتھ سیر (واک) بھی ہوتی رہتی ...... یوں گلی کی رونق اندھیرے میں بھی عروج پر تھی ......زندگی رواں دواں اور ہر غم سے بے نیاز تھی۔ وہ سب بڑا اچھا تھا...... کیا یہاں پر یہ سب ہوگا......نہیں یہ تو وہ جگہ نہیں ہے۔ یہ تو صرف ایک سڑک ہے جہاں بھاگتی دوڑتی گاڑیاں اور چیختے چنگھاڑتے ہارن ہیں ...... یہ سب گھر جو ہیں تو آمنے سامنے......لیکن بند ہیں...... ان میں کون سے لوگ رہتے ہیں ......؟ یہ ہم میں سے نہیں ......؟ کیا یہ کبھی ہم سے ملیں گے یا نہیں...... یہ سوچ کر انھوں نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لی...... اور گیٹ بند کر دیا۔ پھر سورج کی طرف دیکھا...... وہ بھی مسکرا رہا تھا...... گویا کہہ رہا ہو اب تو یہی تمھارا گھر ہے یہیں پر رہنا ہے ماضی میں جانے کا کیا فائدہ اس جگہ کو بھولنے کی کوشش کرو اس خیال کے ساتھ وہ اندر آ گئیں۔ گھر کے کام کاج شروع ہو گئے۔

رات کو سونے کے لیے لیٹیں تو آمنہ نے دادی کو اداس دیکھ کر پوچھا ''دادی جان آپ کا دل لگ گیا اپنا گھر تو یاد نہیں آتا'' آمنہ نے گویا ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا...... ''بیٹا تمھارا لگا...... یہ بتاؤ؟'' وہی سوال دادی نے کر دیا۔ ہاں کچھ کچھ...... پر اپنا گھر تو یاد آتا ہے......بس تو پھر جب تم کو یاد آتا ہے تو مجھے نہیں آئے

گا...... میں تو چالیس سال اس گھر میں رہی ہوں اور تم صرف آٹھ سال۔'' ''اور ابو دادی؟'' وہ تیس سال...... اف اللہ ......تیس سال ...... آمنہ چالیس اور تیس کا حساب لگانے لگی۔ بس اب سو جاؤ آمنہ...... یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں چھلک پڑیں ...... انھوں نے پلکیں جھپکائیں......کروٹ لی ''دادی اب ہم کیا وہاں نہیں جا سکتے'' ...... بچی نے دادی کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا...... ''نہیں بیٹا اب تو یہی ہمارا گھر ہے ہم کو یہیں رہنا ہے۔'' آمنہ کا ذہن ان سب باتوں سے بے خبر تھا۔ وہ دادی سے پرانے گھر کی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن دادی نے اپنا منہ موڑ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ آمنہ ان کی بھیگی پلکیں دیکھے اور پریشان ہو......

میز پر سے پانی کا گلاس اٹھایا ...... نیند کی گولی کھائی اور کروٹ بدل لی ......صبح جب وہ اٹھیں تو ان کا ذہن پریشان تھا...... دماغ بوجھل تھا...... دل میں ہلچل سی تھی ...... فجر کی نماز پڑھ کر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ باہر نہیں نکلیں گی اب وہ تلاوت کرتیں، تسبیح پڑھیں ......کب بچے اسکول جاتے ......کب ارشد دفتر جاتے...... کب گھر کے کام شروع ہوتے۔ وہ ان باتوں سے بے خبر ہو گئی تھیں ...... صبر اور سکون کی دعائیں کرتیں......کبھی انھوں نے سوچا تھا کہ گھر تو انسانوں سے بنتے ہیں در و دیوار سے نہیں ...... یہ بات آج انھیں غلط لگنے لگی تھی ...... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ماضی میں سفر کرنے لگی تھیں......ان کی سوچ رک سی گئی تھی ......ان کی یادداشت میں صرف ماضی ہی تھا...... وہی ان کا حال اور وہی مستقبل۔ جب نظریں ماضی کی دہلیز پر ٹکی ہوتی ہیں...... ملنے جلنے والے رشتے دار نظر آتے ہیں ...... بچے بہن بھائی لگتے ہیں ......بچپن کی باتوں سے دل بہلتا ہے......سارے غم اور ساری فکریں ماں باپ سے منسلک ہو جاتی ہیں ...... یہی سب ان کے ساتھ بھی ہوا۔

دن بھر وہ یادِ الٰہی میں مصروف رہتیں اور رات کو یادوں کی چادر اوڑھ کر آرام سے سو جاتیں......

☆☆☆

فرحی نعیم

قسمت

گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک افراتفری کا سماں تھا۔ ہر کوئی مصروف، کوئی تیاری میں تو کوئی باتوں میں، ایک شور تھا جو سارے گھر میں بپا تھا۔لڑکیاں اپنی ادھوری تیاری کو مکمل کرنے میں سرگرداں تو مائیں اپنے بچوں پر برس رہی تھیں جو یہاں سے وہاں بھاگے دوڑے پھر رہے تھے۔مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام اگرچہ لان میں تھا لیکن چونکہ ابھی سسرال والے نہیں آئے تھے لہٰذا اس طرف کے سارے مہمان گھر کے کمروں میں ہی براجمان تھے۔

''ارے یہ امبر نظر نہیں آ رہی، کیا تیار نہیں ہوئی؟ عارفہ اسے دیکھو کہاں ہے؟'' سب سے پہلے امی کو ہی اس کا خیال آیا۔انہوں نے پاس بیٹھی بھتیجی سے پوچھا۔

''پھوپھو کافی دیر پہلے وہ تیار ہونے گئی تھی۔ میں دیکھتی ہوں۔'' عارفہ نے جواب دیا اور ساتھ ہی امبر کو دیکھنے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ آئینہ کے سامنے بیٹھی نہ جانے اپنے چہرے پر کیا تلاش کر رہی تھی ۔آئی تو وہ سب سے یہی کہہ کر تھی کہ ''میں تیار ہونے جا رہی ہوں۔'' لیکن کتنی ہی دیر ہوگئی تھی اسے یہاں بیٹھے بیٹھے، نہا کر کپڑے تبدیل کر کے اب وہ آئینہ کے سامنے ہلکا پھلکا میک اپ کرنے کے لئے بیٹھی تھی۔سوٹ کے ساتھ کی میچنگ جیولری بھی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی تھی۔لیکن نہ جانے اب کیا ہوا تھا۔صبح سے جو وہ اپنے اوپر ضبط کر رہی تھی اب وہ آنکھوں کے رستے بہہ نکلا تھا۔

''کیا تھا اگر رانیہ کی جگہ وہ ہوتی؟'' اس نے اس کمزور لمحے میں بڑی دل آزاری سے سوچا تھا۔''رانیہ کوئی ایسی حسین تو نہ تھی ہاں لیکن کم عمر تو تھی۔'' اس کے دل نے سوال کیا تو ذہن نے سرزنش کی تھی۔اور وہ! وہ خود اب ایک بڑھتی عمر کی لڑکی ہو رہی تھی۔لڑکی یا عورت!'' دماغ نے پھر اسے ٹوکا ''تو کیا ہوا، دل تو ابھی بھی اس کا بائیس سالہ رانیہ کی ہی طرح ہے، معصوم اور سادہ، اُف!'' اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''کتنی دیر ہوگئی مجھے یہاں آئے لیکن اس خوبصورت ہنگامے میں کسی کو بھی میرا خیال نہیں آیا؟ نہ

فائقہ کو اور نہ ہی امی کو؟'' وہ اس وقت سخت احساس کمتری کا شکار ہورہی تھی۔ اپنی بے چارگی کا احساس اسے مارے ڈال رہا تھا۔

''امبر، امبر دروازہ کھولو۔'' اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی، آواز عارفہ کی تھی۔ امبر نے تیزی سے ٹیشو بکس میں سے ٹیشو گھسیٹ کر آنکھوں کو صاف کیا اور جلدی سے دروازہ کھولنے کے لئے کھڑی ہوئی۔

''امبر!'' عارفہ نے جواب نہ پا کر پھر آواز لگائی۔

''ہاں کھول رہی ہوں۔'' امبر نے گلا صاف کر کے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔اور دروازے کا لاک کھولا۔

''کیا ہوا تم اب تک تیار نہیں ہوئیں؟'' عارفہ کچھ جانچتی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

''بس ابھی آئی پانچ منٹ میں۔'' امبر نے رخ بدل کر جواب دیا۔ اور تیزی سے دوقدم آگے بڑھائے۔

''امبر کیا بات ہے، مجھے بتاؤ۔'' عارفہ پوچھ رہی تھی۔ لیکن اس وقت خدا نے امبر کی مدد کی اور وہ کوئی بہانہ بنانے سے بچ گئی، کسی نے اسی وقت عارفہ کو آواز لگائی تھی، عارفہ کے بچے کی کسی دوسرے کے بچے سے لڑائی ہوگئی تھی اور وہ اب باہر لان میں رورہا تھا۔ عارفہ تو یہ سنتے ہی الٹے قدموں دوڑ گئی تھی۔ امبر نے شکر کا سانس لیا اور واش روم جا کر پہلے اچھی طرح چہرے اور آنکھوں پر پانی ڈالا پھر ہلکا پھلکا میک اپ اور نازک سی جیولری پہن کر باہر آ گئی۔

تقریب کے گھر والی مخصوص بھاگ دوڑ ہر طرف ہورہی تھی۔ ایک طرف لڑکیاں بالیاں، رانیہ کے پاس بیٹھی اس کے ساتھ ہنسی مذاق کررہی تھیں۔ سہیلیاں ذومعنی جملے اچھال رہی تھیں۔ اور رانیہ مسکراتی، شرماتی، جھینپتی، ان کو آنکھیں دکھاتی، دل ہی دل میں مسکاتی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ بہن کی غیر موجودگی کا خیال بھی اس وقت اسے محسوس نہ ہورہا ہوگا۔

''رانیہ کے سسرال والے آ گئے ہیں، امی کو بھیجو۔'' باہر سے بھائی نعمان کی آواز آئی تھی۔ اور بڑی تیزی سے یہ خبر اندر پہنچائی گئی تھی۔ امی، خالہ جان، تائی، بڑی چھوٹی پھوپھی، فائقہ اور مامی جان، خاندان کے سب ہی بڑے، امی کی ساتھ تیزی سے مین گیٹ کی طرف بڑھے تھے۔ استقبال کرنے کو، فائقہ کے ہاتھ میں گجروں کی ٹوکری تھی جو وہ سب آنے والے مہمانوں کو دے رہی تھی۔ لڑکیاں گلاب کی پتیاں آنے والوں پر

اچھال رہی تھیں۔ وہ ایک ٹک یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

''ارے امبر باجی! آپ یہاں کھڑی ہیں خالہ امی اور فائقہ باجی آپ کو بلا رہی ہیں۔'' ایک بچی نے اسے اطلاع دی اور وہ دل ہی دل شرمندہ ہوتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ کسی نے گجروں کی ایک ٹوکری اس کے ہاتھ میں بھی تھما دی تھی۔ تب وہ فائقہ کے پاس جگہ بناتی کھڑی ہوگئی اور مسکرا کر مہمانوں کا استقبال کرنے لگی۔

''کہاں رہ گئی تھیں تم؟'' فائقہ کچھ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔ لیکن وہ مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ ''آج رانیہ نے بھی کسی کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔'' امبر کے دل میں ہوک سی اٹھی، اس نے برابر والے بیڈ پر گہری نیند سوئی رانی کو گردن موڑ کر دیکھا۔ سوتے ہوئے بھی چہرے پر ہلکی سی مسکان تھی یا اسے ہی محسوس ہوئی، تازہ تازہ فیشل، ماسک، رانیہ کا چہرہ بڑا خاص اور نکھرا نکھرا لگ رہا تھا، سوتے ہوئے بھی چہرے پر دلکشی تھی۔

''ہونہہ! یہ سب اس میک اپ والی کا کمال ہے، اسی نے تو نہ جانے کیا الا بلا رانیہ کے چہرے پر ملا تھا اسی کی بدولت یہ نکھار آیا ہے۔'' امبر نے بغور رانیہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے تنفر سے سوچا۔ وہ اس وقت سخت خود ترسی کا شکار تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے جو بھاگ دوڑ ہو رہی تھی وہ آج رانیہ کے منگنی کے فنکشن پر اختتام پذیر ہوئی تھی۔ مہمانوں اور سسرال والوں کے جانے کے بعد گھر والوں نے کھانا کھایا۔ چونکہ فنکشن گھر میں ہی رکھا گیا لہٰذا سارا گھر تلپٹ تھا۔ ان بہن بھائیوں نے تو کہا بھی تھا کہ منگنی کی تقریب کسی چھوٹے ہال میں کر لیتے ہیں لیکن بابا نہیں مانے تھے۔ بابا کی دیکھا دیکھی امی ابھی ان کی ہمنوا بن گئیں۔ بقول بابا ''جب گھر میں جگہ ہے اور انتظام ہوسکتا ہے تو پھر باہر کرنے کی کیا ضرورت ہے، اچھا ہے گھر میں رونق رہے گی۔''

اور یوں اس وقت سارا گھر میدان جنگ کا سا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کے ساتھ ایک وہی تھی جو گھر سمیٹ رہی تھی، فائقہ تو دونوں بچوں کو لے کر ایک کونے میں لیٹ گئی تھیں۔ رہی رانیہ تو وہ اپنے دلہناپے میں گم تھی۔ امی، ابو کو ان لوگوں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔ ماسی بھی ''بہت دیر ہوگئی، بچے پریشان ہو رہے ہونگے۔'' کہہ کر چلی گئی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے ب وہ تینوں اوپری سمیٹ کر، تھک کر چور ہوتے جسموں کے ساتھ اپنے بستروں پر گئے تھے۔

وہ دونوں تو لیٹتے ہی بے خبر سو گئے، لیکن امبر جب اپنے بستر پر لیٹی تو نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اگر چہ جسم دکھ رہا تھا لیکن ذہن جاگ رہا تھا۔ اس کا اوررانیہ کا مشترکہ کمرہ تھا۔ رانیہ نے بڑی لاپروائی سے منگنی کا قیمتی لباس یونہی صوفے پر ڈال دیا تھا۔

جیولری، ڈریسنگ ٹیبل بکھری پڑی تھی۔ چہرہ بھی شاید اوپری ہی دھویا تھا کیونکہ آنکھوں پر اور ہونٹوں پر میک اپ کے اب بھی کچھ آثار تھے۔ وہ کتنی دیر تک رانیہ کے سوئے وجود کو تکتی رہی، پھر تھک کر نگاہیں ہٹائیں اور پھر آہستہ سے آنکھیں موندلیں۔

''پہلے فائقہ، پھر رانیہ، اس کے بعد نعمان بھائی اور پھر سلمان، ایک ایک کر کے سب کی شادیاں ہو جائیں گی اور وہ بدقسمت یونہی بیٹھی رہ جائے گی۔''

امبر نے ایک بار پھر بڑی بے رحمی سے اپنا اور بہن بھائیوں کا تجزیہ کیا۔

''یہ رانیہ کی بڑی بہن ہے، اسکی شادی نہیں ہوئی۔'' کسی نے سرگوشی کی۔

ارے یہ تو سب سے بڑی ہے۔ رانیہ سے بڑی تو دوسری ہے۔''

''ہائے بیچاری''

آج کی تقریب میں بھی ایسے ہی دردناک تبصرے اسکی ذات پر ہوئے تھے۔ جس میں سے کچھ اس نے سنے بھی تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہنے والی سے کہے کہ اسے کیا تکلیف ہے لیکن صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ یہ موقع ایسا نہ تھا۔ یہ کیا بلکہ وہ تو کبھی بھی، کسی بھی موقع پر کسی کو کچھ نہ کہہ سکی، ہمیشہ ایسی ترحم انگیز نظروں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتی۔

امبر، بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی، اس سے چھوٹا نعمان تھا، نعمان کے بعد فائقہ جو نعمان سے ڈھائی سال اور امبر سے تقریباً چھ سال چھوٹی تھی، اسکے بعد سلمان اور سب سے چھوٹی رانیہ۔ فائقہ کی شادی تقریباً چھ سال پہلے وحید احمد سے ہوگئی تھی، دو بچے تھے پانچ سالہ احمر اور ڈھائی سالہ ماہم، وہ اپنے گھر میں خوش باش تھی۔ وحید بھائی بڑے زندہ دل اور ہنسوڑ طبیعت کے انسان تھے، فائقہ پر انہوں نے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہ لگائی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہفتے میں دو تین مرتبہ تو ماں کے گھر ضرور چکر لگاتی، اکثر تو میاں کو بھی فون کر کے یہیں بلا لیتی اور وہ بھی تھوڑی دیر بیٹھ کر، بیوی کو لے کر چلے جاتے۔ امبر اکثر فائقہ کی قسمت پر رشک کرتی۔

''کتنی خوش نصیب ہے یہ، کتنا اچھا شوہر ملا ہے اور ایک میں بدقسمت!'' اس کے جملے کی تان ہر دفعہ اپنی بدقسمتی پر ٹوٹتی۔ ایک دفعہ امی کے سامنے بھی بے اختیار اسکی زبان پھسل گئی، امی تو حیران پریشان اس کی شکل دیکھ کر رہ گئیں۔

''امبر! تم ایسا کیوں کہہ رہی ہوں، کیا تم اپنی بہن سے......'' اس سے آگے امی سے بولا نہ گیا۔

''نن نہیں، امی میں ت......'' امبر گڑبڑا گئی۔

''میری بیٹی! اللہ نے تمہارا نصیب بھی ایسا ہی لکھا ہے، مجھے یقین ہے، بس وقت نہیں آیا، ورنہ مجھے امید ہے کہ تم بھی فائقہ جیسی خوشگوار زندگی ہی بسر کرو گی۔'' امی پر امید تھیں۔

''آپ کو کیا غیب کی خبریں ملتی ہیں۔'' وہ طنزیہ ہنسی۔

''امبر! تم...... بیٹا مایوسی کفر ہے۔''

لیکن جواب میں امبر اپنے ہاتھ کی لکیروں کو گھورنے لگی جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ امی اس سے کچھ اور باتیں بھی کرنا چاہتی تھیں لیکن اس کے لاتعلق سے انداز پر خاموشی سے اٹھ گئیں۔

امبر نے انٹر کر لیا تھا جب اس کے لیے پہلی دفعہ چند خواتین گھر میں آئی تھیں۔ اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ امبر گندمی رنگت کی عام سے نقوش کی لڑکی تھی۔ تیار ہوئی اچھی لگتی لیکن نہ جانے کیوں کوئی بھی رشتہ ایسا نہ تھا جس پر امی، بابا، ہاں کر لیتے، یہ بھی نہ تھا کہ ان کی بہت زیادہ ڈیمانڈ تھی اور جو اچھے رشتے ہوتے وہ پلٹ کر دوبارہ نہ آتے، اسی طرح امبر نے گریجویشن کر لیا۔ امی کو کوئی ایسی جلدی بھی نہ تھی۔ اس لیے سب ٹھیک چل رہا تھا۔ اس دوران فائقہ نے بھی میٹرک کر لیا۔ اب وہ کالج میں داخلہ لے رہی تھی۔

غیر معمولی واقعہ تو اس دن ہوا جب امبر کے لئے آنے والی خواتین نے فائقہ کے لیے رشتہ دے دیا۔ نہ صرف امی، ابو بلکہ امبر بھی چونک گئی۔ اس دن امی نے اور امبر نے بھی پہلی دفعہ فائقہ کو غور سے دیکھا تھا۔

''کیا یہ اتنی بڑی ہو گئی۔'' امی نے دل میں سوچا تو امبر کے دل میں بھی فائقہ کے لئے ایک غیر محسوس سا تاثر ابھرا۔ یہ اتفاق تھا کہ دروازہ اکثر فائقہ ہی کھولتی لہٰذا اس دن بھی فائقہ نے ہمیشہ کی طرح آنے والی خواتین کے لئے بھی دروازہ کھول دیا تھا پھر سلام کرتے ہوئے چلی گئی تھی۔ لیکن وہ چند منٹوں کی ملاقات ہی اس

کے لیے نئے دروازے کھول گئی۔آنے والی خواتین نے اگرچہ بلایا امبر کو،لیکن بعد میں رشتہ دے ڈالا فائقہ کے لئے۔امی نے ان سے تو معذرت کر لی۔لیکن بعد میں فائقہ کو مہمانوں کے سامنے آنے سے منع کر دیا۔لیکن ایسا کب تک ہوتا؟ فائقہ کے ایف اے کرنے کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا،امی،بابا کہاں تک انکار کرتے،آخر کار انہوں نے وحید کا رشتہ قبول کر لیا۔ اگرچہ ایسا کرتے ہوئے انہیں امبر کی دل شکنی کا بھی خیال تھا لیکن وہ مجبور ہو گئے۔

دوسری طرف امبر کے دل میں بھی فائقہ کی طرف سے بال آ گیا تھا حالانکہ فائقہ اس سارے سلسلے میں بےقصور تھی۔لیکن امبر کے لئے وہ بےقصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار تھی۔امی نے فائقہ کی منگنی کے بعد بھی انہیں ٹھہرایا تا کہ دونوں بہنوں کی ساتھ شادی ہو جائے لیکن خدا کو ابھی یہ منظور نہ تھا اور یوں آنے والے دنوں میں فائقہ اپنے گھر کو سدھاری،خدا نے اسے دو پیارے پیارے بچے بھی دے دیئے یوں وہ ایک آئیڈیل زندگی گزار رہی تھی۔

امبر نے وقت گزاری کے لئے مختلف کورسز میں داخلہ لیا تھا،امی بھی کچھ مطمئن ہو گئی تھیں کہ اس نے مصروفیت ڈھونڈ لی ہے۔لیکن کبھی کبھی امبر پر قنوطیت کا دورہ پڑ جاتا اور وہ اس سے سخت احساس کمتری کا شکار ہو جاتی،آہستہ آہستہ اس کی دیگر سہیلیوں اور ہم عمر کزنز کی بھی شادی ہو رہی تھی۔لیکن اصل جھٹکا تو اس وقت لگا جب رانیہ کے بھی رشتے آنے شروع ہو گئے۔امی بڑی عاجزی سے آنے والوں کو اپنی بڑی بیٹی دکھاتیں لیکن نوخیز رانیہ کے آگے امبر ذرا نہ جچتی۔امی ایک دفعہ پھر مجبور ہو رہی تھیں۔اس دفعہ بھی وہی ہوا ایک اچھے رشتے کو امی بابا نے رانیہ کے لئے قبول کر لیا اور یوں رانیہ بھی سہیل کے ساتھ منسوب ہو گئی۔ بڑھتی عمر نے واضح طور پر امبر کے مزاج پر اثر ڈالا دونوں چھوٹی بہنوں اور خاص طور پر رانیہ کی منگنی کے بعد تو وہ اچھی خاصی چڑچڑی ہو گئی تھی۔موڈ ہوتا تو سب سے بات کرتی ورنہ خاموش رہتی۔امی اس کی دل جوئی میں لگی رہتیں،سب چھوٹے بہن بھائی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔اس کے آگے پیچھے پھرتے لیکن وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔اپنی ذات سے،گھر والوں سے اس کے شکوے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

امی اپنے سب ملنے جلنے والوں سے اسکے رشتے کے بارے میں کہنا نہ بھولتیں۔وہ خود بھی پوری کوشش

میں تھیں ہر نماز کے بعد ان کی دعائیں طویل ہوتی جارہی تھیں۔ اب ایک طرف رانیہ کے سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے تو دوسری طرف رشتہ داروں نے نعمان کی شادی کے متعلق بھی کہنا شروع کر دیا کہ کب تک بیٹی کے لئے بیٹے کو بٹھاؤ گی۔ اس کی عمر گنواؤ گی۔ لیکن امی نے دونوں طرف معذرت کی، امبر سے پہلے وہ نعمان کی شادی کا تو سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اور رہی رانیہ تو اس کے سسرال سے بھی انہوں نے بڑے سبھاؤ سے بات سنبھالی۔

وہ بھی ایک عام سا دن تھا، بہت معمولی سی بات پر امبر نے رانیہ کو کھری کھری سنا دی تھیں۔ وہ بیچاری چپ چاپ بہن کی صلواتیں سنتی رہی، امی نے سختی سے اسے امبر کو کوئی بھی جواب دینے سے منع کر دیا تھا۔ امی اس کے لیے ازحد پریشان تھیں۔ اب وہ اکثر غصہ یا لڑائی جھگڑے میں اپنے آپ کو بدنصیب اور بدقسمت کہتی۔ امی اس کی کیفیت اچھی طرح سمجھتی تھیں جبھی پیار سے اکثر اسے سمجھاتی رہتیں۔ لیکن وہ ان سنی کر دیتی۔

اس دن بھی امی نے تہجد میں بڑی گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر کچھ وقت اور اسی طرح سرک گیا تو کہیں امبر کسی نفسیاتی عارضہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اور پھر ان کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔

آج کئی مہینوں کے بعد ان کے کسی ملنے والی کے توسط سے چند خواتین امبر کو دیکھنے آرہی تھیں۔ امی نے امبر کو کئی دفعہ تیار ہونے کو کہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''بیٹا مہمان آتے ہی ہوں گے، تم اب تک تیار نہیں ہوئیں، میں نے تمہیں صبح سے کہا ہوا ہے۔'' امی نے شام تک اسے اسی حلیے میں دیکھا تو بڑی بے چارگی سے کہا۔

''بس میرا موڈ نہیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔ امی کچھ اور کہنا چاہ رہی تھیں لیکن اس نے غصہ سے رخ بدل لیا اور امی کمرے سے باہر آگئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں مہمانوں کی آمد ہوگئی۔ شمع آپا لڑکے کی ماں اور بہن کو ساتھ لائی تھیں۔ امی کو دونوں خواتین بہت اچھی لگیں، سلجھی ہوئی اور سادہ طبیعت کی۔ انہوں نے امبر کو بلانے کا کہا، امی نے رانیہ کو اشارہ کیا۔

''باجی! امی بلا رہی ہیں، مہمان آچکے ہیں۔'' رانیہ نے کمرے میں آکر رسالہ پڑھتی امبر سے

دھیرے سے کہا۔

’’تو؟‘‘امبر نے ابرو چڑھائے۔

’’تو،تو یہ کہ آپ چائے لے آئیں، میں نے بنا دی ہے۔‘‘ رانیہ گڑبڑائی۔

’’چائے بنالی ہےتو،تو خود ہی لے جاؤ۔‘‘ وہ رانیہ کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔

رانیہ خاموشی سے پلٹ گئی اور چائے لیکر روم میں چلی گئیں۔ امی نے حیرت سے چائے لاتی رانیہ کو دیکھا۔رانیہ ان کی حیرت بھانپ گئی تھی۔

’’باجی آرہی ہیں۔‘‘ وہ جلدی سے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتی ہوئی بولی۔تب امی نے سر ہلایا اور مہمانوں کے آگے چائے اور دیگر لوازمات رکھنے لگیں۔مہمانوں نے چائے پی لی لیکن امبر نہ آئی۔ مہمان خاتون نے پھر مسکرا کر امی سے امبر کو بلانے کا کہا،امی نے رانیہ کو دیکھا اور وہ جلدی سے کھڑی ہو کر ایک دفعہ پھر امبر سے کھڑی منت کر رہی تھی۔

’’باجی پلیز! پانچ منٹ کیلئے آجائیں، دیکھیں وہ لوگ کیا سوچیں گے۔‘‘

’’سوچتے ہیں تو سوچیں، میں نہیں آرہی۔‘‘

’’باجی! آپ امی کا تو خیال کرلیں۔ وہاں وہ......‘‘

’’میرے جانے سے کچھ نہیں ہوگا۔انکار ہی ہونا ہے نا تو وہ اب بھی ہو جائے گا۔‘‘ وہ ڈھٹائی سے بولی۔

’’باجی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔‘‘

’’بس، زیادہ میرا دماغ نہ کھاؤ۔اور یہاں سے چلی جاؤ،اور سنو دوبارہ مت آنا۔‘‘

اور رانیہ آنکھوں میں آئے آنسو ضبط کرتی پلٹ گئی۔کمرے میں آئی تو امی نے نظروں ہی نظروں میں اس سے سوال کیا تو اس نے نفی میں گردن ہلا کر انہیں جواب دیا۔ امی سخت پریشان ہوچکی تھیں۔ خدا خدا کرکے،اتنے عرصے کے بعد تو آج لوگ آئے تھے، جو امی کو بہت اچھے بھی لگ رہے تھے لیکن امبر نے آج بڑا غیر متوقع ردعمل دکھایا تھا۔

’’بہن میں بچی کو لاتی ہوں۔‘‘ امی شرمندہ شرمندہ سے اٹھیں۔

’’امبر کیا ہوگیا ہے تمہیں، کیوں تم مجھے مہمانوں کے سامنے بے عزت کر رہی ہو۔‘‘ امی غصہ سے امبر کو کہہ رہی تھیں۔

’’میں نے کہا تو ہے کہ مجھے نہیں آنا۔‘‘ امبر اب بھی رسالہ منہ میں گھسائے ہوئے تھی۔

''چلیں بیٹا آپ نہیں آئیں تو میں آجاتی ہوں۔''
اس جملہ پر امبر اور امی دونوں چونک گئیں۔ دروازے پر لڑکے کی والدہ کھڑی تھیں، جو امی کے پیچھے پیچھے آگئی تھیں اور انہوں نے دونوں کی گفتگو سن لی تھی۔

''بہن! آپ نے کیوں زحمت کی، بس امبر آہی رہی تھی۔'' امی ہکلائیں۔

''کوئی بات نہیں، کیا کرتی ہیں بیٹا آپ؟'' وہ اب امبر سے پوچھ رہی تھیں۔

''کچھ نہیں۔'' امبر نے ایک جھٹکے سے جواب دیا۔

''اچھا، کتنا پڑھا ہے آپ نے؟''

''بی اے کیا ہے۔'' لہجہ اب بھی ہنوز پہلے جیسا ہی تھا۔

'اچھا اچھا ماشاء اللہ آپ نے مجھے بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا۔'' وہ مسکرائیں۔

جواب میں وہ خاموش رہی۔ ایک طرف یہ سوال جواب ہو رہے تھے تو دوسری طرف امی شرم سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔ ان کی امبر ایسی تو نہ تھی۔ کیسی تمیز دار، نرم مزاج، بااخلاق تھی۔ یہ تو دونوں چھوٹی بہنوں کی نسبت اور لوگوں کے رویوں نے اسے ایسا بدمزاج بنا دیا تھا کہ وہ اب ہر ایک سے لٹھ مار انداز میں بات کرتی۔

''بہن آپ کمرے میں چلیں میں امبر کو لے کر آتی ہوں۔'' امی گھبرا رہی تھیں۔

''نہیں بس اب میں چلتی ہوں۔'' وہ نرم لہجے میں بولیں اور باہر نکل گئیں۔ امی بھی امبر پر ایک تیز نگاہ ڈالتی ان کے پیچھے پیچھے نکلیں۔

''بہن دیکھیں میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں، اس کا ایسا رویہ صرف آنے والے رشتوں کے مسلسل پیچھے ہٹ جانے سے ہے پھر دونوں چھوٹی بہنوں کی بات اس سے پہلے طے ہوئی، ایک کی شادی اور دوسری کی منگنی، اس صورتحال نے اسکو اتنا تنک مزاج بنا دیا ورنہ آپ یقین کریں یہ بالکل ایسی نہیں، اتنی نرم مزاج، سگھڑ اور سلیقہ مند ہے میری بیٹی، پھر سمجھدار اور سعادت مند، ہر ایک کے کام آنے والی، آپ کو شاید یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہی ہے۔'' امبر کی خوبیاں گنواتے امی کی آواز بھرا گئی۔

''آپ شرمندہ نہ ہوں بہن۔'' لڑکے کی والدہ امی کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ ''مجھے اندازہ ہے، آپ کی بیٹی کس کیفیت سے گزر رہی ہے، بار بار مسترد ہونے نے آپ نے بچی کی شخصیت پر

برے اثرات ڈالے ہیں۔ خدا نے چاہا تو اب ایسا نہ ہوگا۔ اچھا مجھے اجازت دیں۔'' وہ یہ کہتی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھیں۔ ورنہ ان دونوں کی یہ بات چیت امبر کے کمرے سے باہر نکل کر ہوئی تھی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد امی خاموشی سے لاؤنج پر پڑے تخت پر بیٹھ گئیں۔ رانیہ چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔ امی سخت مایوس تھیں۔ اب اگر وہ لوگ آگے دوسرے سے یہ کہیں یا شمع آپا کو ہی بتا دیں کہ آج امبر نے کیا سلوک کیا تو کیا عزت رہ جائے گی۔

اور یہ ایک ہفتے بعد کی بات تھی کہ شمع آپا مسکراتی گھر میں آئی تھیں۔

''اے طیبہ! بھئی مٹھائی کھلاؤ۔''

''مٹھائی! کس بات کی؟'' امی حیران تھیں۔

''وہ جو پچھلے ہفتے میں جن لوگوں کو لائی تھی، انہوں نے تمہاری امبر کے لیے پیغام بھیجا ہے۔''

''کیا؟'' امی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''ارے تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔''

''نہیں نہیں، لیکن......''

''لیکن، ویکن کچھ نہیں، بس سمجھو اللہ نے تمہاری سن لی۔ سچ کہتی ہوں بڑے اچھے لوگ ہیں۔ مانو تمہاری امبر کا تو نصیب کھل گیا، یہ لو، یہ لڑکے کی تصویر اور اس لفافے میں ساری تفصیلات ہیں، میاں اور لڑکوں کو دکھالینا۔'' وہ خوشی خوشی لفافہ امی کو پکڑاتے ہوئے بولیں۔ اور امی سے تو یہ غیر متوقع خوشی سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔

''ارے تم تو آج چائے پانی سب بھولے بیٹھی ہو، لو میں تو چلی۔'' شمع آپا بولیں تو امی کو یکدم ہڑ بڑائیں۔

''ارے آپا پانچ منٹ بیٹھیں، یہ رانیہ نہ جانے کہاں ہے۔ ابھی میں کہتی ہوں چائے بناتی ہے۔'' امی جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

''چلو خیر ہے، اب چائے نہیں بلکہ مٹھائی تمہاری طرف سے امبر کی منگنی کی مٹھائی اور دعوت کھاؤں گی۔'' وہ ہنستی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ اور امی بغور وہ تصویر دیکھنے لگیں جوان کو بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ امبر تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی۔ چند لمحوں کے لئے تو وہ بھی ٹھٹک گئی پھر بولی بھی تو کیا......

''ہونہہ، شمع خالہ لگتا ہے کہ غلطی سے ہمارے گھر آ گئیں، بھلا مجھ بدقسمت سے کس نے شادی کرنی ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں کہتی آگے بڑھی۔

''امبر خدا کے لئے، کبھی تو اچھا بھی بول لیا کرو، کیوں ایسی باتیں کر کے میرا دل جلاتی ہو۔'' امی نے جواب میں اسے ڈپٹا تھا۔ پھر بابا اور بھائیوں کے آنے پر امی نے انہیں بھی یہ خوشخبری سنائی، بابا نے اگلے ہی دن جا کر معلومات حاصل کیں۔ نعمان نے بھی اپنے ذریعے سے لڑکے کے بارے میں تفصیلات جانیں اور ہر طرف سے ہی اطمینان بخش معلومات حاصل ہوئیں۔ اگر چہ لڑکے کی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن وہ نیک، شریف تھا، مین مارکیٹ میں اس کی دکان تھی جہاں سے مناسب آمدنی ہوتی تھی۔

گھر بھر میں مشورے کے بعد اس رشتے کو قبول کر لیا گیا۔ اور ایک ہفتے بعد ناصر کی والدہ، امبر کے ہاتھ میں روپے رکھ گئیں اور ساتھ ہی انہوں نے اس کی انگلی میں خوبصورت سی انگوٹھی پہنا دی۔ امبر کی ویران زندگی میں گویا بہار اتر آئی۔ سب کچھ بڑا اچھا اور دلفریب لگ رہا تھا۔ امی اور بہنوں کے ساتھ اس کا رویہ آہستہ آہستہ تبدیل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ امی کے ساتھ اب اکثر وہ بازار جا کر اپنی شادی کی تیاریوں میں ہاتھ بٹاتی۔ زندگی اب اس کے لیے بھی خوبصورت ہو گئی تھی اور یوں چند مہینے ہوا کی طرح گزر گئے اور وہ وقت بھی آ گیا جب امبر ناصر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر پیا دیس سدھاری۔

ناصر کے ساتھ زندگی بڑی خوش و خرم گزر رہی تھی۔ اس کی ساس کا فیصلہ بڑا بروقت اور دور اندیشی کی مثال تھا۔ اس کی نندوں نے اگر چہ اس وقت ماں کی مخالفت کی تھی وہ کسی بھی حال میں امبر جیسی اکھڑ لڑکی کو اپنی بھابھی نہیں بنانا چاہتی تھیں لیکن وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کی ماں نے کتنا درست قدم اٹھایا تھا، بیٹیوں کی بھرپور مخالفت کے باوجود ناصر کی والدہ نے ایک لڑکی کو نفسیاتی کیس بننے سے بچا لیا تھا۔ امبر نے چند ہی دنوں میں اپنی خوش مزاجی اور خدمت گزاری کے ذریعے گھر بھر کے دل میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ وہ اس معاملے میں اپنی ساس کی بڑی ممنون رہتی اور دل سے ان کی عزت کرتی جس کا بدلہ اسے ان کی شفقت کی صورت میں ملتا۔ وہ جو ہر وقت اپنے آپ کو بدنصیب اور بدقسمت گردانتی، ہر دم شکوہ جس کی زبان پر رہتا اب خدا سے توبہ استغفار کرتی۔ ناصر، وحید کی طرح تو نہیں لیکن بڑے اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی کی آمد نے اسے بڑا مصروف کر دیا تھا۔ اس دوران رانیہ اور نعمان کی بھی شادی ہو چکی تھی۔

زندگی اپنی رفتار سے گزر رہی تھی جب اس خاندان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وحید، فائقہ کا شوہر ایک حادثے میں انتقال کر گیا۔ اور فائقہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ والدین کے گھر آ گئی اس کی شادی کو بارہ سال گزرے تھے۔ اور ایسا لگتا تھا کہ یہ بارہ سال ایک خواب کی مانند تھے۔ فائقہ کو دیکھ کر امبر کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھتی، کیا اس کی عمر تھی اور کیسا صدمہ پہنچا تھا۔ فائقہ سے شوہر کی جدائی کا صدمہ سہا نہ جاتا تھا لیکن وہ بچوں کی وجہ سے زندگی کی طرف واپس لوٹنے پر مجبور تھی۔ ابھی اس صدمہ کو صرف دو سال کا عرصہ گزرا تھا کہ رانیہ کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔ اسکے سسرال والے بڑے ظالم تھے۔ یہ عقدہ رانیہ کی شادی کے چند مہینے بعد ہی کھل گیا تھا لیکن عین مشرقی لڑکیوں کی طرح، رانیہ بھی سسرال میں صبر وضبط سے زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن اب شاید اس کے سسرال والوں نے اسے ایک اور چرکہ دینے کا عزم کیا اور طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ الزام یہ لگایا کہ چونکہ اس چار سال کے عرصے میں رانیہ کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی لٰہذا ہم بیٹے کی دوسری شادی کریں گے۔ حالانکہ ڈاکٹری رپورٹس سب کلیئر تھیں۔ اور یوں دوسری بیٹی بھی لٹ پٹ کر والدین کے گھر آ گئی۔

امبر جب ماں کے گھر جاتی تو اسے ایسا لگتا کہ امی، فائقہ اور رانیہ کے چہروں پر گویا رنج ثبت ہو گیا ہو، وہ تینوں ہی اسے رنج والم کی تصویریں نظر آتیں۔ وہ تینوں کو مقدور بھر تسلی دلاسے دیتی لیکن سب لاحاصل لگتا۔

اور اسی طرح ایک دن جب امبر رانیہ کے پاس بیٹھی اس سے ادھر ادھر کی عام سی باتیں کر رہی تھی تو اچانک ہی رانیہ نے اس سے ایسا سوال کیا تھا کہ وہ لرز کر رہ گئی تھی۔

''باجی! یاد ہے میری منگنی کے بعد آپ اپنی قسمت کو کتنا موردالزام ٹھہراتی تھیں۔ بات بات پر ہمیں خوش نصیب اور خود کو بدقسمت اور جانے کیا کیا کہتیں۔''

جواب میں امبر کیا کہتی۔ نظریں چرا گئی۔ ''باجی ادھر دیکھیں میری طرف۔'' رانیہ نے اپنی ویران آنکھیں امبر پر جمائیں۔

''کاتبِ تقدیر نے نہ جانے کس کی قسمت میں کتنا سکھ اور دکھ لکھا ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کریں

لیکن یہ یاد رکھیں کہ مصائب ہر ایک کی زندگی میں ہیں، کسی کے پہلے اور کسی کے بعد میں۔ یہ کتنے ہیں یہ تو لکھنے والا ہی جانتا ہے۔بس دعا ہے یہ کسی کی زندگی میں آ کر ٹھہر نہ جائیں۔"

اس نے کچھ فاصلے پر بیٹھی فائقہ کو دیکھا جو بچوں کے کسی جھگڑے کو نمٹاتی ہلکان ہو رہی تھی۔

"اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ آئندہ خدارا کسی کی قسمتوں کا یوں فیصلہ خود نہ کیجیے گا۔"

رانیہ اپنی بات کہہ کر اٹھ گئی تھی۔اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ اس سے امبر بے قصور ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو قصوروار محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

محبت کی کیاری میں

’’حماد! حماد! اٹھیں، دیکھیں، یہ معاذ کو کیا ہوگیا ہے۔‘‘

آدھی سے زیادہ رات بیت گئی تھی۔ اکلوتے بیٹے معاذ کی طبیعت خستہ ہورہی تھی۔ مسلسل قے کے بعد اب منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور ہونٹ سیاہ پڑ رہے تھے۔ دل چڑیا کے بوٹ کی طرح پھڑک رہا تھا۔

حماد نے فوراً معاذ کو گاڑی میں ڈالا اور ڈاکٹر کی طرف چل دیئے۔ ان کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ ادھر معاذ کی ماں صغیرہ کا برا حال ہورہا تھا۔ زینب آپا سجدے میں پڑی اپنے معاذ کی زندگی کی سلامتی اپنے رب سے مانگ رہی تھیں۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں بہہ رہا تھا۔

معاذ احمد، حماد احمد کا اکلوتا لخت جگر تھا جو بڑی منتوں مرادوں کے بعد شادی کے چودہ سال بعد ہوا تھا۔ زینب خاتون بہت اچھی اور پیار کرنے والی خاتون تھیں مگر قسام ازل نے ان کے مقدر میں اولاد نہ لکھی تھی۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مگر جب کوکھ ہی ہری نہ تھی تو ساری دنیا ہی ویران ویران سی تھی۔

زینب خاتون اولاد کی چاہ میں اس قدر بڑھ گئیں کہ معاشرے کی باتوں کو بلائے طاق رکھ کر حماد کو دوسری شادی پر رضامند کرلیا اور ’’صغیرہ‘‘ کو اپنے ہاتھوں سے بڑے لاڈ اور چاؤ سے بیاہ کرلائی۔ اور زمانے میں خود سوکن لے کر آنے والی نئی رسم کی بنیاد ڈالی۔ دو سال بعد اللہ نے معاذ کی شکل میں چاندان کی گود میں لا اتارا۔

صغیرہ اور زینب کا پیار دیدنی تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ سوکنیں ہیں۔ زینب سوچا کرتی تھی کہ جب ہماری شریعت کا ماخذ ثانی میرے محمد کریمؐ کی احادیث انہیں اُخت یعنی بہن کہتی ہیں، تو ہماری لغت میں یہ سوکن یا سوتن کا لفظ جانے کہاں سے آ گیا؟

صغیرہ نے معاذ کو جنم دیا اور گھر آتے ہی زینب خاتون کی گود میں ڈال دیا۔

’’لو آپا یہ تمہارا بیٹا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا

کام۔''

اور زینب خاتون جہاں معاذ کی بلائیں لے رہی تھیں وہاں صغیرہ پر بھی صدقے واری جارہی تھیں۔

زینب خاتون نے صغیرہ کی خوب خوب خدمت کی۔ پورے چالیس دن اسے قدم زمین پر نہ رکھنے دیئے۔ حماد کا خون ان کی باہمی محبت دیکھ کر دو چند ہوجاتا۔ ہر کام دونوں مل کر کرتیں۔ بازار جارہی ہیں تو اکٹھی، کھانا بنارہی ہیں تو اکٹھی، صفائی کر رہی ہیں تو اکٹھی۔بعض اوقات تو دونوں مل کر محاذ بنالیتیں اور تنہا حماد کو اس دونالی بندوق کا سامنا کرنا پڑتا جو بھی انہیں دیکھتا حیران رہ جاتا۔کوئی خوش ہوجاتا کوئی جل جاتا۔ اور تجربہ شاہد ہے اس دنیا میں جلنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔شیطان بھلا کہاں برداشت کرسکتا تھا کہ ہمارے معاشرے کی سوکنیں دورِ محمد عربیؐ کی بہنیں بن جائیں۔ اس نے ادھر ادھر کے لوگوں کی شکل میں ڈھل کر انہیں بہکانا شروع کردیا۔ چھ سال بیت گئے تھے صغیرہ کو زینب کی زندگی میں شریک ہوئے، مگر ابھی تک کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی تھی۔آج چھ سال بعد یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ معاذ کو انتہائی سنگین حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔اسے ایمرجنسی وارڈ میں رکھا گیا۔تین دن بعد اسے ہوش آیا۔

زینب وصغیرہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔معاذ کی جان کی سلامتی کی خوشی میں صدقہ وخیرات کی دیگیں پکائی گئیں۔

ڈاکٹرز کی رپورٹ کے مطابق معاذ کو زہر دے کر مارنے کی شعوری کوشش کی گئی تھی۔ اگر اسے بروقت ہسپتال نہ لایا جاتا تو شاید اب تک وہ شہر خموشاں کا مکین بن چکا ہوتا اور پیچھے دنیا میں چھوڑے جانے والے گھر کو بھی شہر خموشاں بنا جاتا۔ مگر دو ماؤں کی آہیں کام آگئیں۔معاذ واپس آگیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ آخر معاذ کو زہر کس نے دیا......اور کیوں؟؟

صغیرہ نے پورا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا کہ یہ زینب چڑیل جانے کب سے دل میں کینہ چھپائے بیٹھی تھی۔ یہ میرے بچے کی دشمن ہے۔اسے گھر سے نکالو۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

زینب اور صغیرہ کے سوا گھر میں تیسرا کوئی تھا نہیں صغیرہ نے مشقتیں برداشت کرکے اسے جنم دیا تھا۔ اپنے خون سے اسے سینچا تھا۔کیا اپنے لخت جگر کو زہر دے سکتی تھی؟

رہ گئی زینب خاتون! تو حماد کا اس سے قریباً دودہائیوں کا ساتھ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زینب ایسی عورت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی تفتیش ضروری تھی۔

زینب کی زبان گنگ تھی۔ آنکھیں متورم تھیں۔ اس نے اک بار حماد کی عدالت میں کہا:

''حماد! میں نے بیس سال آپ کی رفاقت میں گزارے بیس سال کسی کو سمجھنے اور جاننے کیلئے کافی ہوتے ہیں۔ میں نے صحابیات کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ صغیرہ کے معاملہ میں کبھی حاسدانہ مزاج کو ابھرنے نہیں دیا۔ حالانکہ حسد اللہ نے عورت کی فطرت میں رکھا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے بھی تو مارے حسد کے پیالہ توڑ دیا تھا۔ مگر انہوں نے اس حسد کو اپنے مزاج کا حصہ نہیں بنایا تھا۔ حماد میں نے بھی حسد کو اپنے مزاج میں شامل نہیں کیا۔ حماد میں اپنے غم کی شکایت اپنے رب سے کرتی ہوں۔ اسی کے سامنے آہ وزاری کرتی اور آنسو بہاتی ہوں، جان لیں حماد میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔''

اور خود حماد کا دل بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ زینب نے ایسی حرکت کی ہوگی۔

آخر کار کڑیوں سے کڑیاں ملائی گئیں تو پتہ چلا کہ سگی ماں ''صغیرہ'' نے اپنے بچے کو دودھ میں زہر ملا کر دیا تھا۔

صغیرہ حماد کے بچے کی، اس کی اکلوتی اولاد کی قاتلہ بننے جارہی تھی۔ وہ ماں تھی۔ آخر اس نے ایسی حرکت کیوں کی؟

ہمارے معاشرے کا کوئی عام انسان ہوتا تو جھٹ دونوں میں سے ایک کو، لوگوں کی باتوں میں آکر یا غصے میں، دے دلا کر فارغ کر دیتا۔

مگر وہ حماد تھا نہایت بردبار، متحمل مزاج، خطاؤں سے چشم پوشی کرنے والا، شریعت کا فہم رکھنے والا۔ پیارے حبیبؐ کے فرامین مسلسل اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے:

''عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اگر سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ بیٹھو گے اور اگر چھوڑو گے تو ٹیڑھی رہے گی۔''

''اے انجشہ! ٹھہر کے چل یہ نازک آبگینے ہیں۔''

''اللہ کی بندیوں پر رحم کرو۔ تم کیسے ان کے چہرے پر مارتے ہو حالانکہ تم نے ان کے ساتھ رات گزاری۔''

اف مالک! میں کیا کروں؟ کچھ حماد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔آخراس نے صغیرہ کوتنہائی میں لے جا کر اس کی ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی میں لے کر پیار سے دبایا اور پوچھامعاملہ کیا ہے؟

صغیرہ عورت تھی، بیوی تھی......

وہ بیوی جو اپنے خاوند کے ذرا سے التفات پر اپنے سارے عزم وارادے مٹی میں ملا دیتی ہے۔

وہ عورت ...... جو ہمیشہ خاوند کی ذرا سی محبت پر جان نچھاور کر دیتی ہے۔اس کی دل وجان سے خادمہ بن جاتی ہے شرط محبت ہے۔ یہ مرد ''حاکم'' ذرا مرضی اور محبت سے کام لے کر تو دیکھیں!!!

صغیرہ، جو پہلے ہی ضمیر کے کچو کے سہہ رہی تھی اور اپنے کیے پر نادم تھی، پھوٹ پڑی، حماد کے قدموں میں گر گئی۔

جی حماد! یہ خطا میں نے ہی کی ہے اور آپ کی محبت میں کی ہے حماد! مجھے آپ سے محبت ہے اتنی شدید محبت کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ آپ کے التفات میں میرا کوئی شریک ہو آپ کا زینب خاتون کو بلانا میرے لے ناقابل برداشت ہے۔ حماد مجھے معاف کر دیں......زینب آپا بے قصور ہیں!!

میں ان پر الزام لگا کر انہیں اپنی آپ کی زندگی سے نکالنا چاہتی تھی۔ دوسوکنوں کے مابین نفرت کا پودا محبت کی کیاری سے ہی جنم لیتا ہے اور آکاس بیل کی طرح پھیل کر سارے چمن کا ستیا ناس کر دیتا ہے۔ اُگتے ہی اسے فوراً کاٹ پھینکنا، شیطان مردود سے پناہ میں آنا......تا کہ یہ نفرت کا پودا اگنے ہی نہ پائے کتنا ضروری ہے تا کہ محبت کی کیاری خراب نہ ہو......اُس کا حسن ماند نہ ہو......اسکی زمین ویران نہ ہو۔حماد دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھامے دیر تک ہی سوچتا رہا۔

☆☆☆

اک اور دریا کا سامنا تھا

قطب، ولی، ابدال اور پیروں کے شہر ملتان کے نواحی گاؤں میں پلنے والی ہندو بچی شیلا سے مل کر احساس ہوا کہ بزرگوں کی دعاؤں میں اثر، صداؤں میں تاثیر اور جذبوں میں صداقت ہی تو تھی جو شیلا جیسی بچی نہ تبلیغ، نہ تعلیم، نہ وعظ، نہ نصیحت، خود ہی اسلام قبول کرنے کے لئے اپنے آپ کو بے چین پانے لگی۔

اسکول میں ہم جماعت مسلمان لڑکیوں سے اسلام کے بارے میں پوچھتی، اپنی طلب ظاہر کرتی۔ لیکن وہ ننھی بچیاں تو خود اسلام کے مفہوم سے نابلد تھیں۔ اماں نے کلمہ سکھا دیا۔ تھوڑی سی بڑی ہوئیں تو کچی پکی نماز سیکھ لی۔ جمعہ کے جمعہ یا رمضان میں نماز پڑھ لی۔ اللہ، رسولؐ، توحید، رسالتؐ، ارکان کے متعلق تو معلومات کم ہی گھرانوں میں دی جاتی ہیں۔ اللہ تو ہر ایک کی طلب پوری کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے مانگو اور پھر وہ دیتا ہے بھر بھر جھولی۔

عمر کے ساتھ شیلا کی طلب اور بے چینی بڑھتی گئی۔ گھر کا ماحول، رہن سہن، طور طریقے سب سے بے زاری پیدا ہونے لگی تو والدین کو فکر ہوگئی۔ پہلے سمجھے کہ یہ عمر کا تقاضا ہے۔ بچیاں جب بڑی ہونے لگتی ہیں تو ان میں کچھ خودسری، بغاوت اور ضد پیدا ہوجاتی ہے۔ الجھی الجھی، بے چین اور مضطرب رہنے لگتی ہیں۔

لیکن شیلا کا اضطراب تو بڑھتا جا رہا تھا۔ خوراک میں، لباس میں، نشست و برخاست میں، ہر کام، ہر چیز میں اسکو کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ کیوں؟ اس کیوں کا جواب تو اس کے پاس نہیں تھا۔

اکیلے بیٹھے گھنٹوں سوچتی میں کیا کروں! کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ یہ تو وہ زمانہ ہوتا ہے جب لڑکیاں تمام ہنر اور ہر فن سیکھ لینا چاہتی ہیں۔ اور اس کی برادری کی لڑکیاں تو دوسرے کاموں کے علاوہ ناچ گانوں میں بھی طاق تھیں کہ یہ ان کے مذہب میں فن بھی ہے اور عبادت بھی۔

وہ خود بھی بہت سریلی آواز کی مالک تھی۔ بھجن گاتی تو لوگ بھاگ بھاگ کر مندر کی طرف آتے۔ استاد اس کی لے اور آواز کی تعریف کرتے تو ڈانس ماسٹر اس کی

تھرک اور لچک کی۔

لیکن اب تو اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ احساسات، جذبات، خیالات سب ہی تبدیل ہو رہے تھے۔ بس ایک لگن تھی، ایک دھن تھی اللہ کے سچے دین کی۔ دل میں اسلام کی جوت ایسی جاگی کہ دل کو اسیر کر گئی۔ لیکن علم تھا نہ معلومات، حدود وقیود سے ناواقف......حرم وحجاب سے ناآشنا، حلال حرام، پاکی ناپاکی بتانے سے ہی معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تو پتھر کے اندر پیدا ہونے والے کیڑے اور سمندر کے اندر پلنے والی مخلوق کی بھی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ طلب پوری کرنا اس کا شیوہ ہے خواہ وہ مادی ہو یا اخلاقی، روحانی ہو یا جسمانی۔

روح کی طلب بڑھی تو اللہ نے بندوبست کر دیا۔ محلے میں ایک خاتون قرآن پڑھاتی اور درس دیتی تھیں۔ ایک دن شیلا اپنی سہیلی کے ساتھ ان کے گھر چلی گئی۔ درس کی محفل سجی تھی، خواتین بیٹھی تھیں وہ بھی بیٹھ گئی۔ قرآن کی تاثیر، محترمہ کا دھیما اور پراثر انداز...... ایک ایک لفظ نے اثر کیا۔ شیلا بے قرار ہو گئی۔ چاہتی تھی اسلام کے بارے ایک ہی نشست میں سب معلوم کرے۔

لیکن سہج پکے سو میٹھا ہو

محترمہ نے ایک وقت مقرر کر دیا۔ دین سکھانے اور قرآن پڑھانے کا۔ وہ چھپ چھپ کر بہت باقاعدگی سے پڑھنے لگی۔ بہت تیزی سے سیکھ بھی گئی۔

جب مندر جانا چھوڑا تو بہت لعن طعن ہوئی۔ کس کس بت کو چھوڑتی! گھر کے تو ہر کونے اور ہر طاق پر ایک بت براجمان تھا اور سب کی پوجا کرنا لازمی۔

چھپ چھپ کر نماز پڑھتی زندگی مشکل سے مشکل تر ہو رہی تھی۔ اور پھر ایک افتاد اور آن پڑی، برادری سے رشتے آنے لگے۔ شادی کی عمر ہو گئی تھی اور گھر والے اس کی حرکتوں سے سے بھی خوفزدہ تھے۔

شیلا نے پریشان ہو کر اپنے ایک بھائی اور بہن کو جو اس کے زیادہ قریب تھے، بتا دیا کہ میں مسلمان ہونا چاہ رہی ہوں اور ہر صورت مسلمان ہو کر رہوں گی۔ پہلے تو انہوں نے بہت سمجھایا لیکن اس پکا ارادہ دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

اور پھر شیلا کی رضامندی سے اس کے بھائی نے اپنے ایک مسلمان دوست کے ساتھ اس کا نکاح طے کیا۔ ملتان کی ایک بڑی مسجد میں شیلا نے اسلام قبول کیا۔ اسلامی نام ریحانہ رکھا گیا اور پھر نکاح ہوا۔

ریحانہ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی آ گئی۔ سسرال کے گھر میں خوشدلی سے اس کا استقبال نہیں کیا گیا بلکہ ساس ماں نے تو قبول کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ ایک ہندو لڑکی کو بہو کے طور پر کیسے قبول کر لیتیں۔ کیونکہ نسل چلنی تھی۔ لوگوں نے سمجھایا کہ نومسلم کا درجہ بہت بڑا ہے۔ اس نے اپنا دین مذہب، گھر بار، ماں باپ، بہن بھائی سب چھوڑ دیا صرف اسلام قبول کرنے کی خاطر۔ بادل نخواستہ ساس ماں نے رکھ تو لیا لیکن سلوک اس سے اچھوتوں والا ہوتا تھا۔

پڑھا لکھا گھرانہ نہ تھا۔ روایتوں کی پابند بہو کو حریف سمجھنے والی ساس نے اس کے ہر کام میں کیڑے نکالنے شروع کر دیئے۔ ایک مختلف ماحول میں پلی ہوئی بچی کو تو تربیت کی ضرورت تھی۔ محبت، چاہت اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ طریقہ، سلیقہ، رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا، بات چیت ہر چیز مختلف، ہر کام اور ہر ادا پر نظر تو تھی مگر تنقیدی۔

علم کی کمی اور اسلام سے دوری نے عام لوگوں کے دلوں کو تنگ اور سخت کر دیا ہے۔ ورنہ بہو کو چاہت سے لایا جاتا ہے اور محبت سے وہ تمام طریقے، خاندانی روایات، رشتوں کی پہچان، حقوق و فرائض آہستہ آہستہ منتقل کر دیئے جاتے ہیں کہ ہمارے بعد گھر کی مالکن تو وہ ہے۔

کراچی آ کر ریحانہ نے ایک مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ ایک سال بعد ایک ننھی گڑیا اس کی گود میں تھی بعد ازاں اس نے ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ بچی کو ساس کے پاس چھوڑ کر جاتی تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد عام گھروں کی طرح ان کے گھر میں بھی کھٹ پٹ شروع ہوگئی۔ شوہر نے اس پر ہاتھ اٹھانا شروع کر دیا اور یہ معمول بن گیا۔ وہ کب تک اور کتنا پٹتی۔ آخر کار حالا ت سے دل برداشتہ ہوکر بچی کو لے کر گوشۂ عافیت آ گئی۔ یہ بے سہارا عورتوں کی پناہ گاہ ہے۔ یہاں اس کو دلاسہ دیا سمجھایا بجھایا گیا۔ دو تین دفعہ کی کونسلنگ کے بعد وہ نارمل ہوگئی۔

گوشۂ عافیت میں ریحانہ نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ نئی زندگی پورے شعور اور آگہی کے ساتھ شروع ہوگئی۔ یہاں نماز اور قرآن پابندی کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ رمضان شروع ہوگیا تھا۔ صرف سحری اور افطاری کا اہتمام ہی نہیں بلکہ تراویح اور تہجد کا بھی خیال رکھا گیا۔ ریحانہ گوشۂ عافیت کے انڈسٹریل ہوم میں باقاعدگی سے جاتی رہی۔ اس نے جلد ہی اچھی

سلائی سیکھ لی۔ کچھ مہینوں بعد اس کے شوہر نے رابطہ کیا اور آنے کی اجازت مانگی۔

جب وہ آئے تو ان کو سمجھایا گیا کہ عورت پر ہاتھ اٹھانا بزدلی ہے۔ بہادر تو غصہ پی جاتا ہے۔ بہت منت سماجت کے بعد ریحانہ جانے کے لئے تیار ہوئی۔ اس کو بھی سمجھایا گیا کہ عورت کے لئے شوہر کے گھر سے اچھا کوئی گھر نہیں ہوتا ہے۔ بچوں کو ماں کی محبت کے ساتھ باپ کا نام اور اس کی شفقت چاہیے۔

وہ سعادت مند بیٹیوں کی طرح یہاں سے بہت کچھ سیکھ کر سب کے گلے لگ کر آنسو بہاتی اپنی یادیں چھوڑ کر چلی گئی۔

گوشۂ عافیت کے باسی جہاں اداس تھے، وہیں اس کی زندگی معمول پر آجانے پر خوش بھی تھے اور دعا گو تھے کہ وہ جس رب کی پناہ میں آئی ہے وہ اسے ساری خوشیاں عطا کرے۔

☆☆☆

سفر ہے شرط

لکھاری کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ عام حالات میں لکھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ البتہ جب وہ کسی غم سے دوچار ہوتے ہیں، یا کوئی خوشی ان کو سرشار کرتی ہے، یا وہ محوحرت ہوتے ہیں، یا انہیں کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو ان کے دل کے تار بج اٹھتے ہیں اور ان کا قلم رواں ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کو حسب حال الفاظ کی صورت میں قلمبند کرکے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔ لیکن اس روداد کو لکھنے کے بعد وہ ایسے تہی دامن ہوجاتے ہیں جیسے بارش برسنے کے بعد بادلوں کے ٹکڑے تحلیل ہوکر اوجھل ہوجاتے ہیں۔ تا آنکہ پھر کوئی واقعہ یا حادثہ رونما ہوجائے۔

مجھ جیسے کچھ لوگوں کو لکھنے کیلئے خاصی زور آزمائی کرنا پڑتی ہے۔ خاموشی، تنہائی اور یکسوئی کا حصول درکار ہوتا ہے۔ اگر کبھی خاموشی اور تنہائی کا انتظام ہوجاتا ہے تو یکسوئی کا حصول محال نظر آتا ہے۔ بعض اوقات مطلوبہ ماحول میسر آجاتا ہے۔ موضوع بھی سوجھ جاتا ہے لیکن عین وقت پر خیالات روٹھ جاتے ہیں۔ خیالات کو بمشکل گھیر گھار کر لاتی ہوں تو الفاظ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ بہت کوشش اور تلاش کے بعد اگر چند الفاظ مل بھی جاتے ہیں تو قلم مان کر نہیں دیتا اب میں قلم کی منت سماجت پر اتر آتی ہوں۔

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں
چل میرے گھوڑے چل بھئی چل
بول میری مچھلی کتنا پانی

لیکن خیالات کی دنیا میں، افکار کی وادی میں، اظہار کے گلشن میں کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ اک ہو کا عالم ہے۔ گہرا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ کوئی جوار بھاٹا نہیں، کوئی مدوجزر نہیں، کوئی زیروبم نہیں، غالب نکتہ سنج کی سب گل افشانیاں محوخواب ہیں۔ وہ غزل سرا ہو تو کیونکر، اس عالم میں تو صرف خاموشی ہی بولتی ہے اور وہ سر چڑھ کر بول رہی ہے۔

گھوڑا ہے کہ اپنی جگہ پر جم کر کھڑا ہے، ساکت وجامد، ہل کر نہیں دیتا۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد، یہاں

تک کہ پشت پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اڑانے کیلئے دم تک ہلانے سے گریزاں۔

مچھلی ہے کہ گنگ ہوگئی ہے۔ سر سے کھیلتی ہے نہ منہ سے بولتی ہے۔ بس دم ہلا کر چھینٹے اڑائے جاتی ہے۔

چند لمحوں کے بعد میرے وجود کے اندر سے ایک مضبوط اور توانا آواز بلند ہوتی ہے۔ مانگ، مانگ، شاہ اقلام سے مانگ، شہنشاہ اقلیم سے مانگ۔

اس آواز کے جواب میں ایک کمزور، منحنی سی لرزتی ہوئی صدا ابھرتی ہے۔

کیسے مانگوں؟ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں، وہ انداز کہاں سے لاؤں؟ وہ آداب کہاں سے لاؤں؟ وہ کیفیت کیسے طاری کروں جو مطلوب ہے۔ کیونکہ کسی بھکاری کو اس وقت تک بھیک نہیں ملتی، جب تک وہ رنجیدہ صورت اور کبیدہ خاطر نظر نہ آئے۔ جب تک اس کا غمگین چہرہ، پراگندہ حلیہ، عاجز و مسکین سراپا، پرسوز آواز، گلوگیر لہجہ، اسکی کڑی مجبوری، اسکا اذیت ناک کرب اور اسکا نہاں غم اسکی محتاجی، کمزوری اور بے بسی کا غماز نہ بن جائے۔ اور پھر اسکے دربار کا تو انداز ہی نرالا ہے۔ اگر سوالی کے دل کا دامن عجز سے خالی ہوگا تو کاسۂ گدائی بھی خالی رہ جائے گا۔ ہاں اگر اسکے دل کی دنیا شکست و ریخت اور سوز گداز سے بھری ہوگی تو اسکے کشکول کو لبالب بھر دیا جائیگا۔

کچھ خوش بخت لکھاری ایسے ہوتے ہیں کہ جونہی قلم تھامتے ہیں، ان کو آسانی روانی اور حکمرانی عطا کی جاتی ہے۔ انہیں قلم پر اختیار دے دیا جاتا ہے اور وہ ان کے زیر اقتدار رہتا ہے۔ ان کے ذہن کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ خوبصورت اور پہلودار خیالات قطار اندر قطار، جوق در جوق، ورق در ورق، تہہ در تہہ اندر داخل ہوتے ہی چلے جاتے ہیں اور آن واحد میں ہی موزوں اور پراثر الفاظ لپک کر انہیں خلعت فاخرہ سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ ان کے قلم کا راہوار بے تکان سرپٹ بھاگتے ہوئے منزلیں مارتا زمان و مکان کی منظر کشی کرتے ہوئے قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کرتا چلا جاتا ہے۔ اس عمل کے دوران ان کے ہاتھ تھکتے ہیں، ذہن اکتاتا ہے، زور آزمائی کرنا پڑتی ہے اور نہ ہی ان کا قلم لہولہان ہوتا ہے بلکہ یہ عمل ان کے وجود میں ایک نئی توانائی پھونک دیتا ہے۔ ان کا یہ ملکہ اکتسابی نہیں، وہبی ہوتا ہے۔

جب کبھی ایسے لکھاریوں کی کوئی تحریر میری نظر کے

سامنے سے گزرتی ہے تو مجھے بے اختیار ان پر رشک بھی آتا ہے اور حیرت بھی ہوتی ہے۔ لاشعوری طور پر میرا قد چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ کوہ ہمالیہ کی چوٹی کی طرح بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میری یہ کیفیت، میری نظروں میں میرا یہ مقام اور میری یہ اوقات مجھے رنجیدہ کر دیتی ہے لیکن شکر ہے کہ جلد ہی میرا ذہن میں ایک خیال بجلی کی مانند کوند جاتا ہے کہ جیسے گھپ اندھیری رات کی کل میں سحر کا اجالا پوشیدہ ہوتا ہے، جیسے سوکھے ہوئے ٹنڈ منڈ درخت کے بطن میں ہرے بھرے نرم نرم پتے منہ لپیٹ کر سوئے ہوتے ہیں جسے ڈھونڈنے والے کو صحرا میں بھی زندگی کے آثار مل جاتے ہیں، جسے کھوجی کو اجڑے ہوئے چمن کی مٹی کریدنے سے خوابیدہ، بیج مل جاتے ہیں، جیسے متلاشی کو راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی ننھی منی چمکتی دمکتی روشن چنگاری مل جاتی ہے۔ پھر بھلا کیسے ممکن ہے کہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی ذات میں ڈوب کر خود شناسی کے سفر پر نکل جاؤں اور کچھ بھی نہ پاؤں۔ جبکہ اس کارخانے میں کوئی چیز بھی عبث پیدا نہیں کی گئی۔ صرف سفر ہے شرط!

☆☆☆

رمضان......ماہِ حساب!

رمضان المبارک......ماہ مبارک......جو روزہ دار کی قلبی وروحانی کیفیات ہی کو نہیں بلکہ گھر کے معمولات کو بھی یکسر تبدیل کر دیتا ہے۔

کیسے پاکیزہ، نورانی روز وشب، ہر گھر میں صبح صادق سے قبل بیداری، تہجد کا اہتمام، گھر میں دن میں کئی کئی بار اہل خانہ کی بلند آواز میں قرأت کی آوازیں۔اذان ہوتے ہی باجماعت نماز کی تیاری، گھر کے مردوں اور بچوں کا شوق سے لپک کر مسجد کا رخ کرنا۔گھر میں کچھ خاص پکوان، خواتین خانہ کا ہلکان ہونا کہ مینو اس طرح ترتیب دیں کہ دن بھر کے بھوکے پیاسے بچے غذائی کمزوری کا شکار نہ ہو جائیں۔کھانے میں خاص ڈشیں اور پینے کے خاص مشروبات، پھر افطاری زیادہ بنا کر گاہے بگاہے پڑوس کا حق ادا کرنا۔ کبھی کبھی افطاری پر بہن بھائیوں کو مدعو کر لیا کہ رمضان ''ماہِ مواسات'' ہے۔خیر خواہی اور دل جوڑنے کا مہینہ ہے۔اس طرح ایک طرف رمضان روحانی ارتقاء کا ذریعہ بنتا ہے تو دوسری طرف خانگی وسماجی تعلقات کی بھی استواری کا باعث بنتا ہے۔

ہمارے بچپن میں اکثر گھرانوں میں رمضان کے آغاز سے ہی ٹیلیویژن پر کپڑا ڈال دیا جاتا تھا کہ لغو یات سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی جائے۔اور وقت ضائع نہ ہو کیونکہ دن میں استراحت کا بھی ایک وقت ہو کیونکہ رات کو تراویح بھی ذوق وشوق سے پڑھنا ہے۔گھروں اور محلوں کے الگ ہی انداز واطوار ہوتے تھے ماہ رمضان میں۔شاپنگ ماہ شعبان میں مکمل کر لی جاتی۔کپڑے گھروں میں سلتے اکثر۔اس لیے رمضان کے اوائل میں سلائی مکمل کر لی جاتی تاکہ طاق راتیں متاثر نہ ہوں۔

طاق راتوں کی الگ ہی اپنی شان۔ہر گھر سے کوئی نہ کوئی اعتکاف میں بیٹھتا۔15 رمضان کے بعد سے اعتکاف کی تیاری شروع۔جن کو مسجد جانا ہوتا وہ اس حوالے سے تیاری میں لگ جاتے کہ عید کی تیاری بھی مکمل کر کے جائیں۔خانگی امور بھی نمٹا کر جائیں تاکہ للّٰہیت سے آخری عشرہ گزر سکے۔گھر میں بیٹھنے والی

خواتین معتکفین کی اپنی تیاری۔ ان کے لئے گھر میں علیحدہ جگہ کا انتظام۔ ان کی یکسوئی نہ متاثر ہو اس کا حد درجہ اہتمام۔ گھر کے ایک کمرے کو سمیٹ کر سفید چادر بچھا کر درود وظائف کی کتابیں، قرآن کے نسخے، دینی لٹریچر، ڈھلی ہوئی جائے نمازیں رکھ کر امی جان گویا ایک عشرے کے لئے اس کمرے کو مسجد کا درجہ دے دیا کرتیں۔ کہا کرتیں اس کمرے میں اعتکاف کی نیت سے داخل ہو تو جتنی دیر عبادت میں گزرے گی اعتکاف کا اجر ملے گا۔ کبھی کہتیں کہ ایک نماز سے دوسری نماز تک مصلّے پر تلاوت و تسبیح میں گزارو تو اتنی دیر اعتکاف کا اجر ملے گا۔ گفتگو بھی کم ہی کرتی تھیں۔ بیشتر وقت سفید دوپٹہ زیب تن کیے اور ہونٹ جنبش میں نظر آتے ان کے۔ گھر میں اونچی آواز سے ٹی وی کھولنے، قہقہہ لگا کر ہنسنے اور ہنسی مذاق کو بھی پسند نہ کرتیں کہ یہ مقدس مہینہ ہے ہر لمحہ میں اس کا اکرام ملحوظ رکھنا ہے۔ تب ریڈیو پر ایف ایم وغیرہ تو آتے نہ تھے بیشتر وقت نعتیں یا قوالیاں آتی تھیں مگر نانی جان جب آئی ہوئی ہوتیں تو ریڈیو کھولنے پر بھی پابندی ہوتی کہ توجہ بھٹک جائے گی۔ جو وقت ہے یاد اللہ میں گزارو۔ گھر کی چھوٹی بچیاں بھی سلیقہ سے دوپٹہ اوڑھے رکھتیں اور چھوٹے بچے ٹوپی۔ گھر کی فضا، معاشرے کی فضا سب ہی بدلی بدلی ہوتی۔

بعد از عصر گھر کے مرد بازار کا چکر لگاتے پھلوں وغیرہ کی خریداری کے لئے اور چند منٹ یہ موضوع ہی رہتا کہ کل کے مقابلے میں آج بھاؤ کس درجہ بڑھے ہوئے تھے۔ بچپن سے اک بات میرے ذہن میں نقش ہے کہ ابا جی کا رنگ بدل جایا کرتا تھا ماہ رمضان میں۔ وہ اتنی عجلت میں نظر آتے جیسے ٹرین چھوٹنے کا وقت ہو۔ بیشتر وقت نماز کی چوکی پر تلاوت میں مصروف رہتے۔ رمضان کی راتوں کو شاید ہی کبھی انہیں سوتے دیکھا ہو۔ کہتے تھے بڑی بابرکت راتیں ہیں شاید ہی آئندہ برس نصیب ہوں!

وہ سماج دورنگی کا شکار نہ تھا۔ آس پاس کے سب گھروں میں یہی فضا ہوتی تھی۔ محلے کی خالائیں جو شاید روز ہی ایک دوسرے کے ہاں جھانکتی تھیں مگر رمضان میں آمد و رفت بہت کم ہو جاتی۔ کیونکہ بیشتر وقت تلاوت اور کپڑوں کی سلائی وغیرہ میں گزر جاتا۔

اس وقت نہ بوتیکس کا رواج تھا نہ ٹیلرز کا۔ ہاں اکا دکا سلائی والیاں ہوتی تھیں پوش گھرانوں کی بیگمات ان کی خدمات حاصل کر لیتی تھیں۔ لیکن ہر گھر کی عورت

سلائی جانتی تھی یہ اس وقت کا بنیادی وصف تھا۔ایک بار امی جان کی طبیعت خراب تھی تو محلے کی خالہ بولیں ''نیا لڑکا ٹیلر ماسٹر آیا ہے چورنگی کے پاس دکان ہے بازار میں اس کو بھیج دو اپنے کپڑے۔''امی جان تڑپ کر بولیں ''نامحرم میرے کپڑوں کا ہاتھ لگائے اس سے بہتر ہے کہ پرانے ہی پہن لوں۔'' پھر وہ ٹھیک ہوگئیں اور مشین ہوتی تھی اور وہ، کیونکہ ہم چاروں بہنوں کے بھی کپڑے گھر پر سلنا ہوتے تھے۔

رمضان میں ہر گھر سے سلائی مشین کی آوازیں آتیں۔جو عید کی تیاریوں کی عکاس ہوتیں۔ یوں تو رمضان میں عید کی تیاریوں کی خوشی گھل مل جاتی اور روز وشب اور حسین ہوجاتے۔تب بیوٹی پارلر بھی نہ تھے یوں گلی محلوں میں، چاندرات پر سہیلیاں یا بڑی بہنیں مہندی لگا دیتی تھیں۔امی جان ابٹن منگا کر رکھ لیتیں جو فیشل کا کام دیتا۔

بڑی پیاری یادیں ہیں بچپن کی جو ہم سب کے پاس ہیں۔کیونکہ ہر دور کی اپنی اقدار ہوتی ہیں۔سماج نے کم وبیش ایک ہی رسوم ورواج کی چادر اوڑھی ہوئی ہوتی ہے۔اور اس وقت تو کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ کسی دن رمضان کو یوں ''کمرشلائز'' کر دیا جائیگا۔اور کمرشلائزیشن اسے گلیمرائزیشن کی انتہا تک پہنچا دے گی۔سارا سارا دن کی ''رمضان ٹرانسمیشن''یوں گھروں کی فضاؤں کو مکدر کر دیں گی۔ یوں نیلام گھر سجیں گے۔ ریٹنگ اور دولت کی جنگ میڈیا مالکان کو اس درجہ لالچی بنا دے گی کہ ہر چیز بک جائے گی۔تمام چینلز مختلف انداز سے دکانیں سجائیں گے اور رمضان کی روح کو گروی رکھ کر مادے کی ہوس پیدا کی جائے گی!!

رمضان تو جائز خواہشات کو بھی پابند سلاسل کرتا ہے۔ بنیادی انسانی ضروریات پر بھی ضربیں لگاتا ہے، کھانا، پینا،سونا تو بنیادی ضروریات ہیں، رمضان میں رمضان ان جائز خواہشوں سے بھی دور لے جانا چاہتا ہے کہ ان خواہشوں کی کثرت نے ہمیں انسانیت سے گرا کر ''حیوانیت'' کے قریب کر دیا ہے۔ لہٰذا ایک ماہ ان حیوانی خواہشات سے کسی درجہ میں ناطہ توڑیں۔ 450 گھنٹے کے اس تربیتی کیمپ میں آ کر اپنی روحانیت کے ارتقاء کی فکر کریں۔کیونکہ پچھلے گیارہ ماہ بعد یہ ماہ مبارک صدا دیتا ہوا آتا ہے کہ ''اے بندۂ زمانہ بندگی رب کی طرف پلٹ آ۔'' ذکر، تسبیح، مناجات، استغفار،آہیں، ندامت کے آنسو، پشیمانی

کے سجدے، پلٹ آنے کے وعدے، مگر اب تو فرصت ہی نہیں بندہ مومن کو......ٹی وی چینلز نے ایک تماشہ لگا رکھا ہے اور ہر اک تماشائی۔ دل ان دنیا کی محبتوں سے دور ہوجائے اسی لیے اعتکاف کا حکم دیا گیا تھا۔ چلو طاق راتوں میں خود اپنا کچا چٹھا دیکھو۔ خود سودوزیاں کا حساب کتاب کرو۔ آج نہیں تو کل جانا ہے۔ کیا منہ دکھا سکو گے اس رب کو۔ جس کی نعمتوں سے دامن بھرتے رہے مگر شکر کے انداز اپنائے نہ اطوار۔ مگر اب تو طاق راتیں بھی ٹی وی سکرین پر سجتی ہیں۔ لیلۃ القدر کے لیے کئی دن پہلے بکنگ شروع ہوجاتی ہے ٹی وی چینلز پر۔ ہزاروں کے مجمعے اب ان کی سحر، ان کی افطار کی مجلسیں، ان کی دعائیں، ان کی التجائیں، ان کے آنسو، انکے استغفار اور ہم محض تماشائی، ٹکٹکی باندھے ٹی وی کے سامنے براجمان رہتے ہیں۔ اور احساس بھی نہیں ہوپاتا کہ کیسے تہی داماں ہوگئے ہم۔ مانا کہ میڈیا ایک صنعت ہے اور صنعت کار اپنے سودوزیاں کے پیمانے رکھتا ہے لیکن ایک نظریاتی مملکت میں اکثر کمرشل بنیادیں، نظریاتی بنیادوں کو ڈھا دیں تو حساب کتاب کہاں ہوگا؟ کثیر سرمایہ اور بھرپور فنی مہارت نے ان رمضان نشریات کو وہ مقناطیسی کشش دی کہ کوئی خاص وعام اس کے سحر سے بچ ہی نہ سکا۔

اب سحری بھی ان نشریات کے ساتھ ہوتی ہے اور افطار بھی۔ اور کروڑوں لوگوں کے کروڑوں قیمتی گھنٹے اس ماہ مبارک کے ان نشریات کی نذر ہوجاتے ہیں۔ اب کمرشل ازم ہی سکہ رائج الوقت ہے۔ اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ مطلوب کیا ہے......نفس کی خاطر قربان کیا ہوا ایمان یا ایمان کی خاطر قربان کی ہوئی لذت نفس؟

☆☆☆

بی بی زلیخاؒ

آپ سلطان المشائخ حضرت خواجہ محمد نظام الدین اولیاءؒ محبوب الٰہی کی والدہ ماجدہ تھیں۔ انہیں عام طور پر مائی صاحبہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان کے والد خواجہ عرب نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ پہلے وہ خاص طور پر لاہور آئے بعد میں بدایوں میں رہائش اختیار کی۔ خواجہ عرب نے اپنی صاحبزادی بی بی زلیخا کی شادی خواجہ سید احمد سے کی جو خواجہ علی کے صاحبزادے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب بیسویں پشت پر جا کر حضرت محمدؐ سے جا ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بی بی زلیخا کو دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی عنایت کیے۔ ابھی سلطان المشائخ نے زندگی کی پانچ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ ان کے والد سید احمد بن سید علی کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

ایک روایت کے مطابق مائی صاحبہ نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو انتخاب کا حق دیا جاتا ہے کہ آپ اپنے شوہر یا بیٹے میں سے کسی ایک کو چن لیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مرنا ہوگا۔ مائی صاحبہ اپنے بیٹے کو چن لیتی ہیں۔''

یہ خواب دیکھنے کے کچھ ہی عرصے بعد ان کے شوہر بیمار ہو گئے۔ جس پر مائی صاحبہ بہت متفکر ہوئیں مگر خواب میں کیے گئے فیصلے پر ان کا کوئی اختیار نہ تھا۔ زندگی اور موت کا فیصلہ تو اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ چند دن بیمار رہنے کے بعد خواجہ سید احمد دو معصوم بچوں کو چھوڑ کر دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کا مزار بدایوں کے نزدیک مرجع عوام و خواص ہے۔

بی بی زلیخا نے شوہر کی وفات پر بڑے صبر اور حوصلے سے کام لیا اور سوت کات کات کر لختِ جگر کی پرورش کرنے لگیں۔

وہ بڑی جلیل القدر خاتون تھیں اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے اپنے وقت کی رابعہ بصری تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد ان پر پیغمبری وقت آن پڑا لیکن انہوں نے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ سوت کی فروخت سے معمولی آمدنی پر فاقہ بھی آجاتا اس دن بی بی زلیخا اپنے سعادت مند بیٹے سے فرماتیں:

''بابا محمد! آج ہم لوگ اللہ کے مہمان ہیں۔''

شروع شروع میں نوعمر فرزند والدہ کے ارشاد کا مطلب نہ سمجھ سکے جب سمجھے تو اس میں لذت محسوس کرنے لگے۔ خود فرماتے ہیں کہ میں کئی کئی دن فاقہ کے انتظار میں رہتا کہ اس دن والدہ صاحبہ مجھ سے فرمائیں:

''بابا محمد! آج ہم لوگ اللہ کے مہمان ہیں۔''

بی بی زلیخا نے صاحبزادے کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی اور ان کو تعلیم کیلئے بدایوں کے نامور عالم مولانا سید علاؤالدین اصولی کے سپرد کیا۔ انہوں نے نہایت توجہ اور محبت سے سلطان المشائخ کو تعلیم دی۔ چند سال بعد جب وہ فارغ التحصیل ہوگئے تو بی بی زلیخا نے شہر کے علماء ومشائخ کو بلا کر جلسہ دستار بندی منعقد فرمایا۔ کچھ عرصہ بعد وہ مزید تعلیم کیلئے والدہ ماجدہ کو ساتھ لے کر دہلی چلے گئے۔

اس تعلیم وتربیت کے دوران وہ اجودھن پاک موجودہ پاک پتن تشریف لاتے رہے اور حضرت بابا فرید گنج شکر سے کسبِ فیض حاصل کرتے رہے۔ وہ سال میں ایک مرتبہ رمضان کے مہینے میں تشریف لاتے۔ وہ تین بار پاک پتن آئے۔

جب وہ تیسری بار تشریف لائے تو بابا فرید الدینؒ نے فرمایا کہ آپ کی تربیت پوری ہوگئی اور انہوں نے انہیں مسند خلافت عطا فرمائی اور دہلی جانے کا حکم دیا۔ مرشد گرامی کے ارشاد کی تعمیل میں وہ دہلی گئے اور شہر سے باہر غیاث پور میں مستقل اقامت اختیار فرمائی۔ جب وہ دہلی پہنچے ہی تھے کہ انہیں خبر ملی کہ بابا فریدؒ وفات پا گئے ہیں۔

غیاث پور میں رہائش اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ شہری زندگی کے شور وغل سے دور رہ کر پرسکون علاقے میں رہ کر اللہ کی عبادت اور اس کے بندوں کی تعلیم وتربیت کی جائے۔ یہی جگہ اب بستی نظام الدین اولیاء کہلاتی ہے۔ اس بستی میں محبوب الٰہی کی خانقاہ منبع رشد وہدایت بن گئی۔ ان کی تبلیغی مساعی سے ہزاروں کفار اور فساق وفجور کو ہدایت نصیب ہوئی۔ ان کی برکات وفیوض کی بدولت شراب خوری دورغ گوئی، جوئے بازی، کم تولنے ملاوٹ کرنے اور اس طرح کی دوسری برائیوں کا نام ونشان مٹ گیا۔ عوام الناس کا رجحان دین کی طرف ہوگیا اور سلسلۂ چشتیہ کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

سلطان المشائخ کی خانقاہ کے لنگر سے بیشمار لوگ دونوں وقت کھانا کھاتے تھے اور خانقاہ میں ہروقت

قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں گونجتی رہتیں۔آپ کبھی کسی بادشاہ یا امیر کے آستانے پر نہیں گئے۔ فی الحقیقت آپ اپنے دور کے بایزیدؒ اور جنیدؒ تھے۔آپ نے ربیع الثانی 725ھ میں وفات پائی۔نماز جنازہ شیخ ابوالفتح رکن الدین سہروردی نے پڑھائی۔ان کا مزار بستی نظام الدین اولیاء میں مرجع خواص وعوام ہے۔معروف شاعر امیر خسرو بھی ان کے پہلو میں دفن ہیں۔

ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے جو کوئی ہندوستان کا سفر اختیار کرتا ہے وہ ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے ضرور جاتا ہے۔ ان جلیل القدر علمائے کرام کے مزارات پر جا کر لوگ بہت سی بدعات کے بھی مرتکب ہوتے ہیں جس کی ہمارا دین اجازت نہیں دیتا۔ان سے عقیدت رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بتائی ہوئی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں نہ کہ اسلامی اصولوں سے انحراف کر کے ان علماء کی شخصیت اور پیغام کو مجروح کرنے کا سبب بنیں۔

بی بی زلیخا اپنے پیارے فرزند کا تحصیل علم میں انہماک دیکھتیں تو خوش ہو ہو کر انہیں دعائیں دیتیں۔ وہ صاحبِ نسبت اور مستجاب الدعوات خاتون تھیں مشیت الٰہی کے غلبہ سے ہروقت روتی رہتیں۔ ابھی سلطان المشائخ نے اپنی تعلیم مکمل نہیں کی تھی کہ وہ بیمار ہوگئیں۔ بیماری نے اتنی شدت اختیار کی کہ کھانا پینا چھوٹ گیا اور انہیں یقین ہوگیا کہ اب خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آیا ہی چاہتا ہے۔ سلطان المشائخ جمادی الآخر کا چاند دیکھ کر سلام کے لئے والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ ہر ماہ چاند کی پہلی تاریخ کو اپنی والدہ کی قدم بوسی کیلئے تشریف لاتے تھے۔انہیں دیکھ کر والدہ صاحبہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ”میرے بچے! آئندہ ماہ کس کے سلام کو آؤ گے اور کس سے دعائیں لو گے۔“

حضرت نظام الدینؒ بے تاب ہو کر رونے لگے اور کہا ”اماں جان! ہم آپ کے بغیر کیسے جئیں گے۔“

بی بی زلیخا نے انہیں تسلی دی اور فرمایا ”اس وقت جا کر سو رہو صبح آنا۔“ سلطان المشائخ نے رات بہت بے چینی سے گزاری۔علی الصبح والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔انہوں نے اپنے محبوب فرزند کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہا: ”الٰہی یہ بے کس یتیم اب تیرے حوالے ہے۔“

یہ کہا اور جان جانِ آفریں کے سپر د کر دی۔
جمادی الآخر 648ھ میں وفات ہوئی۔
ان کا مزار دلی میں شیخ نجیب الدین متوکل کے مزار کے قریب موجود ہے۔ان کے مزار کے قریب ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جو بی بی زلیخا کی عبادت گاہ کے طور پر مشہور ہے۔ان کی قبر اور چھوٹے کمرے کے درمیان ان کی بیٹی جنت بی بی کی قبر ہے۔ان دونوں قبروں کے ساتھ بی بی کی بیٹی بی بی زینب کی قبر بھی ہے۔
سلطان المشائخ اپنی والدہ کی جلالتِ قدر کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کو زندگی میں جب کوئی مہم پیش آتی تو اس کا انجام کار ان کو خواب میں دکھائی دے دیتا۔ وہ فرماتے کہ ان کی والدہ مستجاب الدعا تھیں۔ان کا اللہ تعالیٰ سے روحانی رابطہ تھا وہ جو بھی دعا مانگتیں بلا تاخیر ان کی دعائیں قبول ہویں۔
ان کے حالاتِ زندگی مغل بادشاہ اکبر کے دور میں لکھی گئی کتاب ''آئین اکبری'' جو ''ابوالفضل فیضی'' نے لکھی تھی میں بھی درج ہیں۔
(استفادہ: تاریخ اسلام کی چارسو باکمال خواتین از طالب ہاشمی۔انٹرنیٹ)

☆☆☆

فرحت طاہر

ایک شام گل دوپہر کے نام!

عنوان سن کر چونک گئے نا آپ کہ بھلا دوپہر میں کھلنے والے پھول کا نام کیا ہے؟ ذہن پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں! یہ نام ہے مدیرہ بتول صائمہ اسماء کے شعری مجموعے کا! اور یہ ذکر ہے ایک دوپہر کا جب وہ فون پر بتا رہی تھیں کہ دو دن کے لیے کراچی کا پروگرام ہے! اگر ممکن ہو تو کچھ قلم کاروں کے ساتھ نشست کا اہتمام کرلیں.....! یہ بات سن کر ہم خوشی سے کھل اٹھے مگر اتنے محدود وقت میں انتظام کرنا.....! ہماری تو حکومت تک خارجی اور داخلی امور کی حد بندی کا تعین کرنے سے قاصر ہے ہم تنہا کیسے اتنا بڑا فیصلہ کرلیں اور وہ بھی اس عالم میں کہ فوری جواب بھی دینا ہے تا کہ ائر بکنگ کو حتمی شکل دی جاسکے۔

بہر حال قصہ مختصر پروگرام طے ہو گیا۔ یقین کریں یہ ہی مشکل مرحلہ ہوتا ہے باقی معاملات تو گویا خود بخود طے ہو جاتے ہیں۔ where there is will there is a way! اس محاورے کی صداقت تو مسلمہ ہے! مالی معاملات، جگہ کا تعین، رابطے ....وغیرہ وغیرہ جز ئیات تک طے کرنا گویا دانتوں تلے پسینہ آ جائے۔ کراچی جیسے شہر میں جہاں مرکزی، صوبائی اور شہری اداروں کی آپس کی چپقلش نے شہر کو کھنڈر بنا کر رکھ دیا ہے وہیں ایک آسیب ہے جس نے ذہنی اور نفسیاتی خوف کا شکار بنا کر رکھ دیا ہے۔ کوئی بھی پروگرام لندن سے آنے والی ایک کال پر منٹوں میں سمیٹ دیا جاتا ہے! اور تو اور کبھی موسم کے ہاتھوں مہینوں سے طے شدہ پروگرام چند گھنٹے پہلے ملتوی کرنا پڑ جاتا ہے ...ان تمام اگر مگر کے باوجود نشست طے کر لی گئی۔

وہ گرمی کے موسم کا پہلا دن! اچانک بدلنے والے موسم سے بوکھلائے ہوئے جسم خنکی اور خوشگواری ڈھونڈ رہے تھے جو یقیناً اس محفل میں اتر آئی تھی۔ پروگرام کا وقت ایک سے تین بجے طے کیا گیا تھا، اس لحاظ سے درمیان میں لنچ کا اہتمام تھا۔ مہمان خصوصی مجوزہ وقت پر پہنچ گئیں اور شرکاء کے آتے ہی نشست شروع کر دی گئی۔

میزبان کی حیثیت سے حریم ادب کا تعارف

رکھنا ہماری ہی ذمہ داری تھی سوادا کرنی پڑی۔ درمیان میں انتظامی امور کے حوالے سے مستقل مداخلت رہی مگراس کی بھی وجوہات تھیں۔ ریہرسل کی نہ گنجائش تھی اور نہ مہلت! ویسے بھی اس پروگرام کا ایجنڈا کچھ غیر رسمی سا تھا۔تعارف، ایک دوسرے سے واقفیت اور رابطوں کی مضبوطی کیونکہ اس قسم کی نشست کے ضروری لوازمات ابھی تیاری کے مراحل میں تھے۔

شمیم فاطمہ، نصرت یوسف اور حمیرا خالد تو وہ نام تھے جن سے ملنے کا صائمہ اسماء کو اشتیاق تھا کچھ اور بھی نام تھے جن سے رابطہ کوشش کے باوجود نہ ہوسکا تھا۔ دیگر اہل قلم جو موجود تھے ان میں افشاں نوید، روبینہ فرید، ام ایمان، عالیہ شمیم ، صائمہ افروز، سیدہ بنت حسینی، منیزہ نورالعین، نگہت یاسمین، تو قیر عائشہ، اسراء غوری، رافعہ صلاح الدین، رومیصاء وہاب، ام عمارہ، افشاں مراد، فرحی نعیم، طوبیٰ احسن، ......اور بہت سے افراد جو اپنی معذرت اور افسوس کے ایس ایم ایس بھیج رہے تھے، ان میں صبیحہ اقبال، فوزیہ خلیل، ڈاکٹر عزیزہ انجم، ، طیبہ اکرام و دیگر تھے۔ قرۃ العین سلیم، آمنہ عثمان اور عالیہ منصور بھی مدعو تھیں مگر مصروفیات کی وجہ سے نہ پہنچ سکیں۔عقیلہ اظہر بھی عذر کے باعث نہ آسکیں۔

بہت سی بزرگ قلمکار بہنیں جنہیں گاڑی کی سہولت نہ دینے کے باعث مدعو نہ کرسکے اس پر دل گرفتگی تھی تو کچھ ایسے بھی ساتھی تھے جو ایک گھنٹے کے نوٹس پر بھی آموجود ہوئے۔ دل چاہا کہ ادب کو شوق فضول سمجھنے والے افراد بھی موجود ہوتے جو اس شوق، دلچسپی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے جو اس محفل میں موجود تھی۔شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے پر ذاتی وسائل پر پہنچنے والے اپنی علمی اور ادبی پیاس کو بجھانے کی کوشش کررہے تھے جس کا اہتمام اس شہر میں اب نا پید ہوکر رہ گیا ہے!

تعارف کے ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔مزے کے بات یہ کہ کراچی میں رہنے والے بھی اکثر ایک دوسرے سے پہلی دفعہ مل رہے تھے اور حیرت انگیز خوشی کا اظہار کررہے تھے۔کہیں تو طرز تحریر شخصیت کا آئینہ دار تھا تو کہیں ذہن میں بنائی سجائی صورت سے بالکل جدا! بڑا لطف آرہا تھا اس باہمی گفت وشنید میں! اپنا تعارف خود کرانے میں دلچسپ بات یہ ہوتی ہے کہ اپنے بہت ہی قریب فرد کے چھپے جوہر سے آگاہی ہوتی ہے۔

نصرت یوسف کے قلم کا نشتر جس طرح قاری کو

اصل مسئلے کی طرف متوجہ کراتا ہے بالکل ایسے ہی ان کی کاٹ دار گفتگو بھی تمام شرکائے محفل کو منظر نگاری اور کردار نگاری کی جزئیات سمجھا رہی تھی ۔ شمیم فاطمہ کی معصومانہ جاندار گذارشیں، حمیرا خالد کے شگفتہ چٹکلے، محفل کا رنگ دوبالا کیے ہوئے تھے۔ افشاں نوید کی مسرت دیدنی کہ ان کے آفس میں ہی یہ نشست ہو رہی تھی۔ اتنی بڑی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اپنی عمدہ قلمی صلاحیت کا بھرپور استعمال یقیناً اپنے آرام اور نیند کو قربان کر کے ہی ممکن ہے!۔ اللہ کرے کہ یہ جذبہ دوسروں کو بھی منتقل ہو! ام ایمان جو عقیلہ اظہر کے ساتھ مل کر حریم ادب کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں اس کی پذیرائی پر شاداں ہیں۔ عقیلہ آپا کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوئی۔

گفتگو کے دوران صائمہ اسماء نے برملا کراچی کی قلمکاروں کو خراج تحسین پیش کیا جن کی نگارشات رسالے کی زینت بنتی ہیں۔

اس ضمن میں انہوں نے روبینہ فرید کے تعاون کو سراہا جنہوں نے کراچی کے شعراء اور ادباء کو بتول میں لکھنے کی طرف راغب کیا۔ تمام تر مصروفیات کے باوجود روبینہ کی یہاں آمد ان کی ترجیح کو واضح کر رہی تھی۔ اس حوصلہ افزائی پر دل سے مشکور تھے۔

اس محفل سے اپنے لیے جذبے کشید کرنے والوں میں جہاں مستند ادبی شخصیات تھیں وہیں پر اعتماد اور باحوصلہ نوجوان قلمکار بہنیں بھی اپنے لیے کچھ نہ کچھ اصول پلو میں باندھ رہی تھیں۔ اس موقع پر ہمیں اپنی فائل میں موجود ان تمام قلمکار بہنوں کی فہرست یاد آئی جن سے ہم وقت کی تنگی کی وجہ سے رابطہ کرنے سے قاصر رہے تھے۔ دو باتوں پر آراء کا تبادلہ خیال ہوا۔ ایک تو یہ کہ کیا موضوع دے کر لکھوایا جا سکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ بتول کا اداریہ سیاسی ہو یا نہ ہو؟ قلمکار کو خود ایک تڑپ ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی تبدیلی کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے قاری تک پہنچائے اور بتول کے اداریے کا اپنا ایک الگ رنگ ہوتا ہے۔ رہنمائی، ذہن سازی! سیاست جو طرز معاشرت اور معیشت پر اثر انداز ہوتی ہے تو ادب پر رنگ ڈالتی ہے اور موضوع قلم بنتی ہے! یہ تھا متفقہ اعلانیہ!!

جب گفتگو کی باری آئی مہمان خصوصی یعنی صائمہ اسماء کی تو سب ہمہ تن گوش تھے۔ وہ جو عام سی بات بھی اتنے گہرے اور ادبی لہجہ میں کہتی ہیں کہ سننے والا اس کے حصار میں آ جاتا ہے۔ کئی دفعہ کی سنی ہوئی حدیث مبا

رکھا تنے موثر پیرائے میں پیش کی کہ ہم سب اپنا تعلق محمد ﷺ سے فخریہ محسوس کرنے لگے۔خوبصورت لب و لہجے کی شاعرہ جونثر میں بھی الفاظ کے موتی پرو دیتی ہیں مگر اپنے آپ کو بس اداریے تک محدود کرلیا ہے۔شاید اس کی وجہ ان کی وہ ٹوپیاں ہیں جن نے ان کومصروف کر رکھا ہے۔توقع اور امید ہے کہ وہ اس گذارش پر ضرور توجہ دیں گی کہ ادب عالیہ پر بھی اپنے قارئین کو رہنمائی دیں!

وہ کہہ رہی تھیں کہ زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ زندگی میں حساسیت اور جذباتیت کم ہونے سے جوٹھہراؤ آتا ہے اسے بھی تو تحریر کرنا چاہیئے۔علمی یا دوسری ضروریات ہوسکتی ہیں مگر اپنے آپ کو آمادہ رکھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور رکھیں۔تخلیقی فرد کی زندگی کو دوسروں سے مختلف ہونا بھی چاہیئے اور نظر بھی آئے۔متحرک رہیں اور تحریک پیدا کرنے کے لیے معلومات کو، تجربے کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔لکھنے کے لیے یکسوئی ضروری ہے مگر اس سے پہلے مشاہدہ تحقیق اور دماغ سوزی بھی درکار ہے......قاری کو احساس ہوئے بغیر آخر تک پہنچانا ہے۔جلد بازی، بے صبری نہیں چلتی! گہرائی میں اترنا پڑتا ہے......حکمت، دانشمندی اور تحمل کا زیور پہننا پڑتا ہے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی......مگر گھڑی کہہ رہی تھی کہ محفل سمیٹنی ہے اب! چنانچہ بات کو مختصر کرنا پڑا۔ کھانا لگائے کب سے منتظمین انتظار میں تھے مگر باتیں تھیں کہ ختم ہی نہیں ہو پا رہی تھیں۔ہر ایک اس فکر میں کہ زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیا جائے نہ جانے ایسی محفل پھر کب نصیب ہو؟ صائمہ اسماء کی آمد اور ملاقات ہی ایک تحفہ نہیں تھی بلکہ وہ حقیقتاً بھی کراچی کی قلم کار بہنوں کے لیے کتابوں بھرا سوٹ کیس لے کر آئی تھیں جو سب میں تقسیم کر رہی تھیں۔دوسری طرف بھی جذبے کم نہیں تھے شرکاء کھانے کو موقوف کر کے ان کے دستخط ان کتابوں پر کروانے کو بے چین تھے۔یہ سارے مرحلے بخیر وخوبی انجام پائے تو روانگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شرکاء ہاتھوں میں گجرے اور اسکی خوشبو کے ساتھ اس محفل کی یادیں لے کر رخصت ہوئے۔

صائمہ اسماء کو ائیر پورٹ چھوڑ کر گھر پہنچے بھی نہ تھے کہ شرکاءمحفل کے خوبصورت تہنیت بھرے پیغامات موصول ہونے لگے۔ان میں سے ایک یہاں عرض ہے

''........ایک بہت یادگار دن جس کی یاد کبھی کسی تھکے ہوئے دن کا بوجھل پن کم کرنے کو کافی ہوگی ان شاءاللہ!''

دل شکر کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ سیروں خون بڑھتا محسوس ہونے لگا اگر تھوڑی سے روپے، وقت، توجہ اور رابطے اتنا مثبت اثرات چھوڑ تے ہیں تو سودا برا نہیں !! ذراسی محنت اتنا تحرک پیدا کر سکتی ہے تو بھرپور جدوجہد کس قدر اثر انگیز ہوسکتی ہے!

قلم کاروں کو متحرک کرنے سے پہلے خود کو مہمیز کیسے کیا؟ یہ بھی بتانا ضروری ہے!

اس پروگرام کے حوالے سے انتظامی مشکلات اور حوصلہ شکن حالات نے اتنا مضمحل کیا کہ نشست سے تیس گھنٹے پہلے اس کو بہت محدود سطح پر منعقد کرنے کا سوچ کر بستر پر سونے چلی گئی۔ عالم خواب میں ایک مانوس سا بچپن کے گھر کے قریب کا جنگل کا منظر جس کے کنارے پر کھڑی میں پگ ڈنڈی سے گزرنے سے منع کر رہی ہوں (گویا اس نشست کے انعقاد کو رد کر رہی ہوں) انکار کے جواب میں ایک معصوم سی مانوس آواز آتی ہے کہ اس راستے پر نہیں جاؤ گی تو محمد ﷺ سے کیسے ملوگی؟؟ یہ جملہ سن کر آنکھ کھلتی ہے تو اذان فجر کا وقت تھا!

اس persuasion کے بعد ناممکن تھا کہ اس کام کو ٹالا جا سکے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پتلی سی پگڈنڈی ضرور اس شاہراہ پر جا کر ملتی ہے جہاں رسول ﷺ سے ملاقات ہو اور پوچھ بیٹھیں کہ اپنے محاذ کا کتنا حق ادا کیا! جنت کے ڈھیروں راستے ہوں گے ان میں سے شاید ایک اس طرف بھی جاتا ہوگا! یہ بات جواز بنتی ہے کہ ہم اپنے قلم کا حق بہترین طریقے سے ادا کرنے والے ہوں!

☆☆☆

روبینہ عاطف

اُف یہ عالمی گاؤں

چل انشاء اپنے گاؤں میں جہاں سچے رشتے یاروں کے
جہاں گھونگٹ زیور ناروں کے
جہاں جھرنے کومل سُر والے
جہاں ساز بجے بن تاروں کے

انشاء جی کے اشعار پڑھتے ہوئے میرا دھیان اپنے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ آپ یقیناً سوچنے لگے ہیں کہ میں کہوں گی میرا گاؤں ''چک فلاں فلاں'' ہے۔ اسکے کے کھیت سرسبز۔ ٹھنڈے پانی کی نہریں۔ ٹیوب ویل، بیلوں کی گھنٹیاں، ٹریکٹر کی گھر گھر ہے۔ مولوی چراغ دین ہیں جن سے سب دین کی روشنی پاتے ہیں۔ ماسٹر علم دین جن سے علم حاصل کرتے ہیں۔ چچا حکم داد جن کا حکم گاؤں بھر کے چھوٹے بڑے مانتے ہیں۔ ماسی برکتے جن کی برکت سے گھروں کے جھگڑے گھروں میں ہی طے پا جاتے ہیں۔ جی نہیں جناب! ایسا کچھ بھی نہیں، کیونکہ میں 1900 سو کے کسی گاؤں کی نہیں بلکہ 2014 کے عالمی گاؤں کی باشندہ ہوں اور میں ہی کیا آپ سب بھی اسی کے باشندے ہیں۔

کتنا فرق ہے 1900 اور 2000 کے اس گاؤں میں۔ پہلے لوگ گاؤں سے شہر آ کر یہاں کے رہنے کے طور طریقے سیکھتے تھے۔ لیکن اب شہر میں رہنے والوں کو عالمی گاؤں میں رہنے کے اطوار سیکھنے ہیں۔ جی ہاں یہ مشورہ ہمیں بچوں اور اکثر ملنے والوں کی جانب سے ملتا رہتا اور ہم ہر بار کنی کترا جاتے۔ لیکن ایک دن حد ہو گئی اور ہم نے اس میدان میں کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہوا یوں کہ اکیڈمی سے آتے ہوئے تیمور سائیکل سے گر گیا۔ ''مما میں سائیکل سے گر گیا تھا'' اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی اعلان کیا۔ ''اوہو، زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں نہیں خیریت ہی رہی۔''

''چلو اللہ کا شکر ہے'' کہہ کر میں گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ''السلام علیکم'' میں نے فون اُٹھا کر کہا دوسری طرف جرمنی سے بڑے بھائی جان تھے۔ ''ارے بھائی جان آپ میں نے چہک کر کہا کیسے ہیں؟'' ''اوہو بھئی مجھے

چھوڑو۔تم بتاؤ تیمور کا کیا حال ہے؟ کیسا ہے وہ ؟
''تیمور'' اسے کیا ہوا؟'' میں نے حیرانی سے کہا ''بھئی اسکا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔'' ایکسیڈنٹ میں نے حیرت سے کہا۔''ہاں ہاں بھئی اس نے فیس بک پر لکھا'' Had an accident today'' کیا جھوٹ بول رہا تھا۔''

''نہیں نہیں۔''میں گڑ بڑا گئی وہ دراصل سائیکل سے گرا تھا بے وقوف نے اُسے ہی ایکسیڈنٹ لکھا ہو گا۔''میں نے انھیں تسلی دی۔''تیمور یہ کیا بے قوفی کی تم نے......؟ سائیکل سے گرنے کو ایکسڈنٹ کیوں لکھا؟'' میں نے اُسے ڈانٹا۔

''جی اس میں غلط کیا ہے۔سائیکل سے گرنا حادثہ ہے۔''

''ہاں ہےتو''

''حادثے کو انگلش میں ایکسڈنٹ ہی کہتے ہیں نا؟'' اس لیے میں نے لکھ دیا۔'' نہایت اطمینان سے جواب آیا۔

''بے وقوف جانتے ہو مجھے بھائی جان کے سامنے کتنی شرمندگی ہوئی۔وہ کیا سوچتے ہوں گے کیسی لاپرواہ ماں ہے اسے بچے کی خبر ہی نہیں، یا پھر یہ انکا بچہ جھوٹ بولتا ہے۔''

''اوہ God! مما ایسا کچھ نہیں ہے آج کل فیس بک پر لوگ سب کچھ لکھ دیتے ہیں۔کیا کیا، کیا کھایا کب اُٹھے، کب سوئے، آپکو تو کچھ پتہ ہی نہیں۔''

اس نے رحم بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں کسی نئے نویلے پینڈو کی طرح اس ''عالمی باشندے'' کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔اور دل میں اس دریا میں کودنے کی ٹھان لی۔لیکن سیکھوں کس سے......بچوں کو تو اپنے رابطوں سے فرصت نہیں! سوچا کہ قریبی سہیلیوں سے مدد لی جائے۔ایک قریبی سہیلی کے ہاں پہنچی اور اپنا مدعا بیان کیا۔'' ارے دفع کرو سکون سے رہتی ہو کیوں اپنا سکون برباد کرتی ہو۔'' وہ پھٹ ہی پڑی۔''لیکن کچھ دن پہلے تو تم فیس بک کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں کہ اسکی بدولت آپ دنیا بھر میں موجود رشتے داروں سے رابطے میں رہتے ہو۔''

''ارے انہی رابطوں نے تو مروا دیا ہے۔''

''کیا مطلب۔'' میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی''۔
کیا بتاؤں میکے سسرال کے سبھی رشتے دار فیس بک پر ہیں۔جس کا جو دل چاہے لکھ دیتا ہے۔شامت میری آجاتی ہے۔میں تو صفائیاں ہی پیش کرتی رہ جاتی ہوں اور اگر کبھی میری کوئی بات سسرال والوں کو ناگوار لگ

جائے تو فوراً میرے شوہر کو اطلاع ہو جاتی ہے اور گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے میں نے تو توبہ ہی کر لی اسے ہاتھ لگانے سے۔''

ان سے جواب ملنے کے بعد ایک دوسری سہیلی سے رابطہ کیا۔ انکے صاحبزادے پچھلے کئی ماہ سے فیس بک پر امریکا میں رہنے والی کسی پاکستانی لڑکی سے رابطے میں تھے۔ اور یہ لوگ اس سے شادی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ میری بات سن کر انکی آنکھیں بھر آئیں۔ آنے والے آنسوؤں کو روک کر انھوں نے کمپیوٹر اور جدید ٹیکنالوجی کو بے نقط سنا ڈالیں۔ میں نے حیرانی سے اس کایہ پلٹ کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ جس لڑکی کی خاطر انھوں نے خاندان بھر کی لڑکیوں کو چھوڑا اور سب کی نظروں میں بُری بنیں وہ اصل میں ایک لڑکا تھا جو ان کے بیٹے کے ساتھ محض مذاق کر رہا تھا اسکی کہانی سن کر مجھے انشا جی کی نصیحت یاد آئی۔

یہاں اُجلے اُجلے روپ بہت پر اصلی کم بہروپ بہت
اس پیڑ کے نیچے کیا رُکنا جہاں سایہ کم اور دھوپ بہت
چل انشاء اپنے گاؤں میں بیٹھیں گے سکھ کی چھاؤں میں

چنانچہ ہم نے دریا میں کودنے کے بجائے کنارے سے نظارے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن یہ مسئلہ میری ذات یا میرے گھر تک محدود نہیں بلکہ پورا معاشرہ اسکی لپیٹ میں ہے۔ اور تو اور ایک دن عطاء الحق قاسمی صاحب کا کالم نظروں سے گزرا جس میں وہ منور حسن صاحب کو عالمی گاؤں کے طور طریقے اختیار کرنے کی راہ دکھا رہے تھے۔ یہ درست ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کو چھوڑ کر یا دنیا سے کٹ کر ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ آپکو یہ یاد رہے کہ

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ﷺ ہاشمی

ٹیکنالوجی بذات خود بری نہیں اس کا استعمال مثبت کاموں کے لئے اپنی دینی اقدار کو مدنظر رکھ کر کرنا ضروری ہے۔ لوگوں سے رابطے بھی رکھیں لیکن اپنی شناخت برقرار رکھیئے ورنہ تبدیلی کی تیز ہوائیں سوکھے پتوں کی طرح آپ کا وجود بکھیر دیں گی اپنے دین سے جڑے رہیں کیونکہ دنیا اور آخرت کی کامیابی دین سے گہری وابستگی ہی میں ہے اس لئے:

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

☆☆☆

میمونہ حمزہ

چند روز امارات میں!

بچپن میں پاکستان کے بعد جس ملک کا نام کثرت سے سنا تھا، وہ دبئ تھا، جہاں نکمے اور ان پڑھ نوجوانوں کی کھیپ کی کھیپ بھیجی جاتی تھی۔ جو بچے بھی پاکستان میں کسی علم و ہنر سے وابستہ ہونے میں ناکام ہو جاتے پھر انکا آخری ٹھکانہ دبئ ہوتا۔ ماں باپ زیورات اور جمع پونجی کی قربانی دے کر اور بیشتر حالات میں قرض اٹھا کر بھی اپنے نالائقوں اور حالات کے ستائے ہوؤں کو دبئ بھیج دیا کرتے، پھر چند دن کے لئے خاموشی چھا جاتی، بالکل ایسے جس طرح تالاب میں پتھر پھینکنے کے بعد کچھ دیر بعد سطحِ آب پر سکون ہو جاتی ہے۔ چند برس میں ان گھرانوں کی نہ صرف معاشی حالت تبدیل ہو جاتی، بلکہ معاشرے میں ان کی ساکھ بھی بہتر ہو جاتی، اور جب یہ کماؤ پوت وطن واپس لوٹتے تو انکے ہمراہ بڑے بڑے صندوق ہوتے، جس میں خاندان کے ایک ایک فرد کے لئے قیمتی تحائف ہوتے، گھڑیاں، استریاں، ٹیپ ریکارڈر، ٹیلیوژن، اور وی سی آر اور دیگر بہت سی معلوم اور نا معلوم اشیاء! انکے لئے رشتوں کی لمبی لائنیں ہوتیں، جن میں سے کسی ایک کے سر پر عزت اور توقیر کا ''ہما'' بٹھا کر چند ماہ بعد وہ ایک نئے سفر پر گامزن ہو جاتے۔ جس خاندان کا ایک فرد باہر پہنچتا، اسکا کچا مکان پکے اور ایک منزل کئی منزلوں تک رسائی حاصل کر لیتی، (اونچے اور پکے کوٹھوں اور پھر کوٹھیوں کی طلب مزید بڑھ جاتی) کے بعد دیگرے انکے باقی افراد بھی اسی ٹکسال میں پہنچ جاتے۔

ہم نے بھی بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر تک ''دبئ'' کی کرامات دیکھیں، مگر اس سرزمین کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا، تقریباً دو دہائیاں قبل اس کے ساحلوں پر لنگر انداز شوخ رنگ کشتیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، جب ہمارا جہاز مانچسٹر جاتے ہوئے یہاں چند گھنٹے رکا تھا، مگر ہم نے اسکی کھڑکی سے ہی اسکا نظارہ کیا تھا۔ اب شوہر نامدار دبئ میں ایک کانفرنس میں مقالہ پڑھنے جا رہے تھے تو انہوں نے پیش کش کی کہ میں بھی وہیں آ جاؤں، اور میں جو قازقستان کا ویزہ نہ ملنے پر

دلگرفتہ تھی اس آفر کو رد نہ کر سکی کیونکہ ایک ٹکٹ میں دو مزے تھے، میری دو بہنیں بھی شارجہ میں مقیم ہیں، سو ان سے ملاقات کا موقع بھی مل رہا تھا۔

اگلے چند روز میں نہ صرف ویزا لگ چکا تھا، بلکہ ٹکٹ بھی ہمارے ہاتھ میں تھا، (ہمارے بھانجے محسن نے تمام انتظامات پلک جھپکنے میں کروادیے، اللہ اسے خوش رکھے)۔ روانگی سے دو روز قبل ویزہ ''او کے ٹو بورڈ'' بھی ہوگیا، یہ ''یواے ای'' انتظامیہ کی پاکستان پر نظر خاص کی علامت ہے، کہ ویزا اور ٹکٹ خریدنے کے مراحل سے فارغ ہوکر ایک مرتبہ پھر ائرلائن سے کنفرم کرانا پڑتا ہے کہ جس مسافر کو ویزا ایشو کیا گیا تھا وہی سفر کررہا ہے، ہم نے اس اقدام کی تفصیل پوچھی تو برادر انجم سعید نے بتایا، پاکستان کے ایجنٹ حضرات ویزا کسی اور کے لئے لیتے، اور ماہرانہ انداز میں اس نام کو تبدیل کر کے کسی اور کو بھجوادیتے، اور جب معصوم مسافر ائرپورٹ پہنچتا تو یواے ای لسٹ میں ویزا کسی اور کے نام ہونے پر اسے سیدھا جیل بھیج دیا جاتا۔ اسی بے ایمانی کو کنٹرول کرنے کے لئے صرف پاکستانی مسافروں کو ''او کے ٹو بورڈ'' کے اضافی تفتیشی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہم پاکستانی ایجنٹ حضرات کو ہدایت کی دعا ہی دے سکتے ہیں، جس کی بنا پر ہر ملک میں ہمیں کوئی نہ کوئی اضافی ''پھول'' لگا دیا جاتا ہے۔

۱۶ اپریل ۲۰۱۴ء کو ہم ائر بلیو کی پرواز نمبر ۲۱۲ کا وقت کنفرم کر کے بروقت ائرپورٹ پہنچ گئے، اندر داخل ہوتے ہوئے زبان پر دعائیں تھیں، اپنے لئے، پیچھے والوں اور آگے والوں کے لئے!!

ایف آئی اے حکام بڑی پھرتی سے مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے، ہماری باری آئی تو کمال مہربانی سے ارشاد ہوا:

''کوئی ایک بیگ کھول کر چیک کروادیں''

ہم نے بھی ہینڈ کیری کی زپ کھول دی، بولا: ''سبزیاں لے کر جارہی ہیں؟''، اب ہم اسے کیا بتاتے کہ یہ ہمارے باغیچے کی پھول گوبھی ہے، جو وطن کی سوغات کے طور پر جارہی ہے (اگرچہ ہمارے باغیچے میں گلاب کے پھول بھی کھلے تھے، مگر انکے مرجھا جانے کا اندیشہ تھا)۔

بیگ بند کرتے کرتے وہ ذاتی معلومات لینے لگا، کہاں سے ہیں؟، کیوں جارہی ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ ہم نے اسے دو مرتبہ بتایا: ''ہاؤس وائف''، مگر اسے

یقین نہ آیا(کم از کم اسکے اصرار سے ایسا ہی لگ رہا تھا)، ہم نے نسبتاً تفصیل بتائی، پی ایچ ڈی سکالر ہوں، اسے تسلی ہو گئی ، بولا، آپ پڑھی لکھی ہیں آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے، جاؤ بھئی انکا سامان کلیئر کرواؤ۔ بورڈنگ اہلکار بولی، میں نے خواتین کے ساتھ آپکی نشست رکھی ہے، بڑی خوشی ہوئی کہ ہماری درخواست سے قبل ہی ہمیں آرام دہ اور پرسکون سفر کی نوید سنائی جا رہی ہے۔

امیگریشن کی لائن میں کھڑی دو بیٹیوں سے ملاقات ہوئی، وہ بھی پہلی مرتبہ شارجہ جا رہی تھیں۔ امیگریشن آفیسر پختون خوا سے تھا، عموماً اس جگہ خاتون اہلکار ہوتی ہے، اور تازہ تصویر کے ساتھ پاسپورٹ میں لگی تصویر کو جانچا جاتا ہے، ہم تذبذب کا شکار تھے، مگر اس نے تصویر بنائے بغیر ہمارا پاسپورٹ سٹیمپ کر دیا، ہمارے دل سے خان صاحب کے لئے دعا نکلی، جامہ تلاشی اور ہینڈ بیگ کی تفتیش کے مرحلے میں ہم ایک مرتبہ پھر پھنس چکے تھے، ہم سے اگلا خاندان شاید مانچسٹر کی پرواز سے جا رہا تھا، پہلے انکا ایک بیگ نشان زد ہوا، معلوم ہوا خاتونِ خانہ نے چلتے چلتے آخری لمحوں میں اس میں چند ''تالے'' ڈال دیے تھے، کہ ائرپورٹ پر سوٹ کیسز کو مقفل کریں گی مگر سامان بورڈ ہو چکا تھا، اور اب تالے مشین میں بول کر نا صرف اپنی بے قدری کا گلہ کر رہے تھے، بلکہ پورے خاندان کے پاؤں میں قفل ڈال دیے تھے۔ ابھی بیگ صفائی کے مراحل میں تھا کہ اگلے بیگ میں کھلونے بول اٹھے، کیونکہ بیٹری لگا کر کھلونا کلیئر نہیں ہوسکتا، اب اس بیگ سے سامان کا ڈھیر نکال کر چھوٹے بڑے کھلونے تلاش ہو رہے تھے، کہ انکا اگلا بیگ بھی بول اٹھا، ہم نے سائیڈ سے ہو کر اپنا لیپ ٹاپ اور ہینڈ کیری اٹھایا اور لاؤنج کی راہ لی۔

جہاز میں اپنی نشست پر بیٹھی تو معلوم ہوا کہ جن سے قطار میں ملاقات ہوئی تھی وہی دونوں میرے ساتھ بیٹھی ہیں۔ دونوں کے حالات میں کافی مماثلت تھی، نورالعین کی شادی کو چار ماہ ہوئے تھے اور صبا کی شادی کو دو ماہ، دونوں کی شادیاں اپنوں میں ہوئی تھیں، دونوں دو دو ماہ کے وزٹ ویزے پر جا رہی تھیں، دونوں کا یہ شارجہ کا پہلا سفر تھا، بلکہ صبا پہلی مرتبہ جہاز میں بیٹھ رہی تھی، دونوں کے کثیر العیال والد وفات پا چکے تھے، نور نے بتایا کہ اس کے والد بیٹی کی شادی کے دو ماہ بعد ہارٹ اٹیک میں چل بسے، سب سے چھوٹا بھائی ابھی

سات برس کا ہے۔نور کا تعلق آزاد کشمیر کے ایک شہر سے تھا اور صبا کا ڈی آئی خان سے، اپنے والد کو یاد کر کے وہ بھی آبدیدہ تھی۔اسکے والد ڈاکٹر تھے، بولی جو لوگ شیعہ اور سنی کو لڑانا چاہتے ہیں انہوں نے میرے والد کو قتل کیا، ڈی آئی خان میں کبھی سنیوں کو مارا جاتا ہے اور کبھی شیعہ حضرات کو، میرے ابو کے دوست ڈاکٹر کو پہلے دن قتل کیا گیا، انکا تعلق اہلِ سنت سے تھا، ہم سب کو انکے قتل کا بہت دکھ تھا، میرے والد انکے جنازے میں بھی شریک ہوئے، ہمارے انکے خاندان سے مراسم بھی تھے، اگلے روز ابو کو کلینک میں ایک شخص بلانے آیا کہ میری بیوی کی طبیعت خراب ہے، گھر آکر ڈرپ لگا دیں، وہ اس کے ساتھ چلے گئے، ڈرپ لگائے چند منٹ ہوئے تھے کہ دو لوگ موٹر سائیکل پر آئے اور ابو کو گولیاں مار کر چلے گئے، ہمیں معلوم ہے ہمارے والد کو بھی گزشتہ روز کے مقتول کے وارثوں نے نہیں مارا بلکہ انہیں لوگوں نے مارا ہے جو یہاں شیعہ سنی کی لڑائی لگانا چاہتے ہیں۔

صبا بہت پیاری معصوم سی لڑکی تھی، اب خاندان والوں نے والدہ کا نکاح چچا سے کر دیا ہے، پچھلے برس اسکی بڑی بہن کی شادی ہوگئی اور اس برس صرف میٹرک کی تعلیم کے بعد اسے بھی رخصت کر دیا گیا، صبا بتا رہی تھی کہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے، ابھی میرے فرسٹ ایر کے امتحانات تھے مگر شوہر نے بلا لیا، کوئی بات نہیں ابھی عمر ہے، اگلے سال امتحان دے لوں گی، اسکی آنکھوں کے دیے روشن تھے، گزرے کل کے الم تھے، مگر ایک قوس قزح سے بھرپور مستقبل کی امید بھی تھی، جسکے رنگ اسکے سادہ اور معصوم چہرے کو اور بھی پرکشش بنا رہے تھے۔

جہاز تیاری کے مراحل میں تھا، صبا بولی: آنٹی مجھے بیلٹ نہیں لگانی آتی، میں نے اسے بیلٹ باندھی، جہاز رن وے پر چلنا شروع ہوا تو اس کے ہاتھوں میں پسینہ آنے لگا، آنٹی میں تو جھولے پر بھی نہیں بیٹھتی، مجھے بہت ڈر لگتا ہے بلندی سے، اس نے بوتل سے چند گھونٹ پانی پیا، ہم نے اسے باتوں میں لگا لیا، جب جہاز فضا میں بلند ہوا تو وہ کلماتِ شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے زیادہ ڈر نہیں لگا، میں نے اسے کھڑکی سے نظارہ کرنے کو کہا تو وہ ڈرتے ڈرتے دیکھنے لگی، اور پھر اسکا خوف بھی دور ہو گیا۔

ائر بلیو پرواز کی ہوسٹس بھی پاکستانی تھیں، اور وہی پاکستانی مزاج !! ایک صاحبہ نے بچے کے لئے دودھ

مانگا تو اتنا انتظار کروایا کہ یاددہانی کے باوجود اس وقت لا کر دیا جب بچہ رورو کر ہلکان ہو چکا تھا۔ایک صاحب نے پانی مانگا تو انہیں بھی نظرانداز کر دیا، البتہ سیٹ نمبر تین، جہاں بوڑھی مارگریٹ، اور اسکا خاندان بیٹھا تھا انکی اتنی دلداری کہ انکے بچے تک بہلائے جا رہے تھے،آخر پانی مانگنے والے صاحب سے رہا نہ گیا،انہوں نے آواز لگائی، میرا خیال ہے آپکو مسافروں کے لئے نہیں سیٹ نمبر تین والوں کے لئے ہائر کیا گیا ہے۔

جہاز سمندر کی حدود میں اڑنا شروع ہوا تو صبا پر ایک مرتبہ پھر خوف کا دورآیا مگر پھر سنبھل گئی،مگر جب جہاز لینڈنگ کے لئے نچلی سطح پر آیا تو صبا کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں، ایک جھٹکے پر وہ چلائی ''یا علی مدد''، اور پھر سبحان اللہ کا ورد کرتی رہی، اسکے کان بند ہونے لگے،نور نے اسے ایک ببل گم نکال کر دی، جہاز لینڈ ہونے تک وہ ہم دونوں کا ہاتھ پکڑے رہی، زمین پر اترتے ہی اسکی خوشی دیدنی تھی، اسکا شوہر باہر پہنچ چکا تھا،وہ بھی اسے یقین دلا چکی تھی،ایک آنٹی ہیں میرے ساتھ، وہ باہر تک ساتھ ہی ہوں گی۔ہم جہاز سے تقریباً آخر میں نکلے تھے،قطار میں کافی آخر میں جگہ ملی،مگر اسی لمحے ہمیں یاد آ گیا کہ عرب ممالک میں خواتین کو قطار میں کھڑا نہیں کیا جاتا، بلکہ وہ کاؤنٹر پر سب سے آگے پہنچ سکتی ہیں،سو ہم نے ان دونوں کو اشارہ کیا اور قطار سے باہر چلتے ہوئے کاؤنٹر پر پہنچ گئے، اسی وقت ایک عرب اہلکار پکارا، ائر بلیو والے ادھر، اور مسافر اسکے اشارے کی جانب چلنے بلکہ بھاگنے لگے، کچھ دور چل کر دائیں جانب تین قطاریں بن چکی تھیں، ہم پھر آگے چلے گئے، یہاں ''آنکھیں کھلواکر'' سکین کی گئیں، اور اگلے کاؤنٹر پر ویزا مہر لگائی گئی۔ ہمارے فارغ ہونے تک سامان بیلٹ پر آ چکا تھا، اپنا سامان ٹرالی میں ڈالا اور پھر صبا کا،نور تو صرف ہینڈ کیری لائی تھی،صبا حیران تھی، آنٹی آپ اتنا بھاری بیگ کیسے اٹھا لیتی ہیں، اب اسے کیا معلوم کہ ہماری تمام عمر اس دشت کی سیاحی میں گزری ہے،کبھی انگلینڈ،کبھی کویت اور کبھی قازقستان، جہاں ہر سفر میں ہم تقریباً تنہا تھے!!

باہر نکلے تو سب کے میزبان حاضر تھے،نور اور صبا کے شوہر موجود تھے،اور ہماری باجی بتول بازو پھیلائے کھڑی تھیں، ہم نے انہیں نور اور صبا سے ملوایا، گوہر مراد ملنے کے بعد سبھی رخصت کو تیار تھے، ہم ٹرالی گھسیٹتے باجی کے پیچھے چلنے لگے، گاڑی میں سامان رکھ کر باجی کو یاد آیا کہ پارکنگ ٹکٹ مشین میں ڈالنا ہے، ہمیں گاڑی

میں بٹھا کر وہ مشین کی جانب چلیں، واپس آ کر گاڑی پھر اسی جانب موڑ دی، ہم نے حیرت سے پوچھا، اگر راستہ یہی ہے تو گاڑی میں بیٹھ کر ہی کارڈ مشین میں ڈال لینا تھا، بولیں: دراصل میں بھول گئی تھی۔ پارکنگ سے نکل کر گاڑی فراٹے بھرنے لگی، باجی کمال مہارت سے ڈرائیو کر رہی تھیں، کچھ دور جا کر فائزہ (بہو) کو فون کیا، ہم راستے میں ہیں، باجی کی کوشش سے سڑک پر ٹریفک جام سے پہلے ہم گھر کے پاس پہنچ چکے تھے، ہم نو واردوں کی مانند سڑک پر لگے عربی اور انگلش بورڈ پڑھ رہے تھے، شارجہ کے نیچے حیرت انگیز طور پر ''الشارقہ'' نظر آیا، ہم نے یہ تو سنا تھا کہ مصری جیم کو گاف پڑھتے ہیں، اور انکے ہاں ''جنۃ'' بھی ''گنۃ'' ہے، اب شارجہ کو عربی میں الشارقہ اور انگلش میں شارجہ بولا جاتا ہے، کیوں؟ ہم اب تلک یہ گتھی نہیں سلجھا سکے۔

ہم شارجہ کے ''لغتی'' مسئلے میں کھوئے ہوئے تھے، کہ اگلے رہنمائی بورڈ پر لکھے ''دبی'' نے ہماری توجہ کھینچ لی، یعنی ''دبئی'' خود دبئی میں ''دبی''، اور اسکا دارالحکومت ابوظہبی ''ابوظبی'' ہے، ہمارا سر گھوم کر رہ گیا، جب عربی زبان کے تمام حروفِ تہجی اردو میں بھی موجود ہیں تو تلفظ فرق کیوں ہے، ویسے تو گلاب کو جس نام سے بھی پکارا جائے، وہ گلاب ہی رہتا ہے، مگر کوئی ''غلاب'' کہے تو کانوں میں کھجلی سی ہونے لگتی ہے، یہی حال ہمارا تھا، ہم کبھی عینک لگا کر اور کبھی اتار کر اور کبھی آنکھیں رگڑ کر اس اختلاف میں سے اتفاق کی راہیں نکالنے کی کوشش کر رہے تھے، آخر ہم نے دل کو تسلی دے لی، ''اس امت کے لئے اختلاف بھی رحمت ہے۔''

ہم التعاون کے علاقے میں پہنچ چکے تھے، ''عرب مول'' کے قریب سے گاڑی موڑتے ہوئے باجی نے خوشخبری سنائی کہ ہم گھر کے پاس پہنچ چکے ہیں، اونچی اونچی عمارتوں کے ساتھ بڑے بڑے قطعہِ ارضی پارکنگ کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ باجی خوش تھیں کہ اپارٹمنٹ کے قریب ہی پارکنگ مل گئی، ہم نے بڑا بیگ گاڑی میں چھوڑا اور ہینڈ کیری اٹھا کر باجی کے پیچھے ''برج زاخر'' کے آٹومیٹک دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ دائیں جانب انتظار گاہ تھی، جس میں صوفے رکھے تھے، سامنے انتظامیہ کا ڈیسک، برج زاخر اندر سے دو حصّوں میں منقسم تھا، دونوں جانب ۴،۴ لفٹیں تھیں، ایک لفٹ صرف سامان لے جانے کے

لئے تھی۔ گراؤنڈ فلور پر انتظامیہ کے کمرے اور مسجد تھی، ہم لفٹ میں داخل ہوئے تو باجی نے نمبر ۱۰ دبایا، اس برج میں پہلے آٹھ فلور پارکنگ کے لئے مختص ہیں، اور اسکے بعد ۳۳ رہائشی منزلیں ہیں، اسکے بعد ایک منزل مردوں اور عورتوں کے الگ الگ فری ''جم'' کے لئے ہے، یہیں دعوتوں اور پارٹیوں کے لئے ہال ہیں، بچوں کے لئے پلے ایریا ہے، جس میں جھولے، سائیکلیں اور کئی دوسرے کھلونے لگے ہیں، عمارت کی چھت پر جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں، درمیان میں پارٹیشن ہے، ایک جانب مردوں اور لڑکوں کے لئے سومنگ پول ہے اور دوسری جانب خواتین اور بچیوں کے لئے، اور یہیں پر چینجنگ رومز اور غسل خانے ہیں، اوپر کی جانب انتظامیہ اور سیکیورٹی کے اہلکار دن دس بجے سے رات دس بجے تک موجود رہتے ہیں تاکہ خواتین اور بچے بلا جھجک ان سہولیات سے استفادہ کرسکیں، چھت پر ہیلی پیڈ بھی ہے، فائزہ نے بڑی تفصیل سے ہمیں ایک ایک گوشے کی سیر کروائی تھی، بولی یہاں تقریباً ہر عمارت میں ہیلی پیڈ بھی ہوتا ہے، تاکہ حادثے کی صورت میں مکینوں کو بحفاظت باہر نکالا جا سکے، اس سلسلے میں ہدایات یہی ہیں کہ اگر آپ زمین کی قریبی منزل میں ہیں تو سیڑھیوں سے نیچے اتر جائیں اور اگر بالائی منزلوں پر ہیں تو چھت پر پہنچیں تاکہ ہیلی کاپٹر کی مدد سے باہر نکالا جائے، یہاں تقریبا ہر برج میں یہ تمام سہولیات موجود ہیں، فائزہ نے ارد گرد کی کئی عمارتوں کے ہیلی پیڈ دکھائے، بے اختیار ہمارے منہ سے نکلا، ''اللھم زد فزد'' ہمارے ہاں تو چند منزلہ عمارت میں آگ لگ جائے تو اس تک پہنچنے کے لئے نہ فائر بریگیڈ کے عملے کے پاس اتنی اونچی سیڑھی ہوتی ہے نہ پانی ڈالنے کے لئے پائپ کی لمبائی۔ بلکہ کچھ عرصہ قبل کراچی میں لگنے والی ایک آگ کے موقع پر ایک نوجوان چھت پر چڑھ کر لٹک بھی گیا، مگر اسکی کوئی مدد نہ ہوئی، لوگ اسے دیکھتے ہی رہے، اور تماشائیوں کا جمگھٹا بڑھتا رہا، مگر کوئی تدبیر نہ کر سکے، حتی کہ اسکے ہاتھ چھوٹ گئے اور وہ زمین پر گر کر موت کا شکار ہو گیا، حالانکہ قریب ہی فوم کے گدوں کی ایک دکان بھی تھی!! شاید اسکا مردہ جسم سب سے سوال کر رہا تھا ''الیس منکم برجل رشید''۔

دسویں منزل کے ۱۰۵۶ نمبر اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو بھینی بھینی خوشبو نے ہمارا استقبال کیا، فائزہ بھی کچن سے نکل آئی، فائزہ باجی کی بڑی بہو ہیں، ہمارا

ان سے دوہرا تہرا بلکہ ان سب سے بڑھ کر دل کا رشتہ ہے، دین کی خاطر رشتہ! فائزہ کے والد حافظ مشتاق، شہید ہیں، سوافغانستان کے شہید کی بیٹی دل میں بہت بلند مقام پر ہے۔ ہم نے اردگرد جائزہ لیا، در و دیوار خیر مقدمی آرائش سے سجے تھے، ہمارے غلط فہمی میں مبتلا ہونے سے قبل باجی نے بتایا، یہ سب آرائش ''نور'' کی آمد کی خوشی میں کی تھی، ''نور'' باجی کی تین ماہ کی لے پالک پوتی ہے، جو حال ہی میں انکے خاندان کا حصّہ بنی ہے، اور منجھلے بیٹے بہو کے ساتھ دبئ میں رہتی ہے۔

کھانے کی میز پر بیٹھے تو معلوم ہوا کہ باجی تو ''ڈائٹ پلان'' کے رحم و کرم پر ہیں، گزشتہ چار ماہ سے ڈاکٹر نیوٹرنٹ کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہیں، ہم نے باجی کے سراپے پر اچٹتی نگاہ ڈالی، اس پلان نے انکے خدوخال پر کافی زیادہ اثر ڈالا تھا، ہم اپنی پلیٹ بھرنے کو تھے کہ باجی نے ہلکی غذا اور غذائیت پر پرمغز گفتگو شروع کر دی، ہم بوکھلا گئے، ''باجی اس طرح تو ہم کچھ نہ کھا سکیں گے، اس بارے میں کل نہ بات کریں؟'' یوں باجی ہلکا پھلکا کھانا کھانے لگیں، اور ہم سفر کی محرومیوں کو پورا کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد محسن (چھوٹے بھانجے) بھی آ گئے، آپ بھی محض عرف میں چھوٹے ہیں، دو بچوں (ازکی اور یحیی) کے والد ہیں، ان کے سراپے پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ موصوف بھی کسی پلان کا شکار ہیں، گزشتہ دو ماہ میں پندرہ کلو وزن کم کر چکے ہیں، ہم نے گھبرا کر فائزہ کی جانب دیکھا، وہ کسی ڈائیٹ پلان کے بغیر ہی سمارٹ لگ رہی تھیں، ہمیں تو یہاں تقریباً دو ہفتے گزارنے ہیں، ہمارا گزارا کیسے ہو گا؟ ہمارے کسی پلان یا اعلان سے قبل حسن البنا آ گئے، یہ ہمارے سب سے بڑے (اور موجودہ حالات میں سب سے وزنی) بھانجے ہیں، اور حسن نے ہمارا مسئلہ حل کر دیا، حسن گھر میں ہونے والی ہر ڈائٹ سرگرمی کے مخالف بلکہ باغی ہیں، اس ڈائٹ سرگرمی کے بعد جہاں محسن کو اپنی پینٹ اور شرٹس آلٹریشن کرانی پڑ رہی تھی، وہیں حسن نے بتایا کہ پچھلے ہفتے جو کپڑے پورے تھے اس ہفتے تنگ ہو چکے ہیں!!

کھانے کے بعد فائزہ نے قہوہ پلایا، محسن نے کچھ دیر باہر گھمانے کی پیش کش کی، اگر تھکاوٹ نہ ہوتو! ہم جھٹ تیار ہو گئے۔

اپارٹمنٹ سے باہر نکلے تو برقی روشنیوں کی عجب جھلمل تھی۔ ہم قدم آگے بڑھاتے تو روشنیاں خود بخود

جل اٹھتیں، اور گزرنے کے بعد گل ہو جاتیں، یہ استقبال نہ صرف خوبصورت لگتا ہے بلکہ بجلی کی کفایت کا نہایت عمدہ طریقہ بھی ہے، وہ دن کب آئے گا جب ہم ایسے انتظامات بلکہ حسنِ انتظام سے استفادہ کریں گے، ابھی تو حال یہ ہے کہ ملک میں ہر جانب بجلی کی کمی کا رونا ہے، اور لوڈ شیڈنگ دورانیہ بڑھتے بڑھتے حال یہ ہو گیا ہے کہ بجلی آتی کم اور جاتی زیادہ ہے، اس کے باوجود قوم کو اس قحط سے نکالنے میں شریک نہیں کیا جاتا، یا کم از کم شرکت داری کا احساس پیدا نہیں کیا جاتا۔ چند برس قبل جب میں کویت میں تھی، اور وہاں بجلی کی کمی کا معاملہ درپیش تھا تو پوری قوم کو اس پریشان کن صورتِ حال میں اقدامات میں شریک کیا گیا تھا، جیسے اگر آپ اپنے گھر کی بجلی کے استعمال میں اتنے فیصد کمی کر دیں تو بجلی کی بندش سے بچ سکتے ہیں، جیسے فلاں سے فلاں وقت تک اپنے گھر کی آدھی روشنیاں گل کر دیں، پارکنگ اور گارڈن کی لائٹس بند رکھیں، اداروں کے اوقات میں بھی کچھ کمی کی گئی، او یہ ہدایات نمایاں جگہوں پر لٹکائی گئیں الحمدللہ لوڈ شیڈنگ کے بغیر ہی بحران پر قابو پالیا، مگر ہمارے ہاں آج بھی ایک جانب بجلی کی بندش کے اتنے اتنے طویل دورانیے، اور دوسری جانب دوپہر بارہ بجے تک کتنے علاقوں کی سٹریٹ لائٹ تک جل رہی ہوتی ہے۔

ہم محسن کے پیچھے چلتے ہوئے لفٹ میں داخل ہو گئے۔ پڑوسی گیس بھروانے کے لئے سلنڈر لے کر جا رہا تھا، برج زاخر سے باہر ایک جانب سپر سٹور تھا اور دوسری جانب فارمیسی، باہر موسم گرم تھا، مگر زیادہ شدت نہ تھی، محسن نے گاڑی موڑتے ہوئے ''ڈی واٹسن المستشفی التخصیصی'' دکھایا

''مونا خالہ، اسے پہچانا؟''

ہم نے لاعلمی کا اظہار کیا، بولا'' یہی وہ ہسپتال ہے جہاں پرویز مشرف کی والدہ کا علاج ہو رہا تھا''۔ پھر خود ہی بولا'' دراصل اس ہسپتال کا انتخاب بھی اسی لئے تھا کہ من مانی رپورٹ نکلوائی جا سکے، اگر والدہ واقعی شدید علیل ہوتیں تو اتنے چھوٹے ہسپتال میں نہ لائی جاتیں، بلکہ انکا ٹھیک طرح علاج کروایا جاتا، اور پھر یہ بھی کیا منطق ہے کہ مشرف کی بیمار والدہ سے ملاقات کے پاپڑ بیلے جا رہے ہیں، اور دوسرے بھائی اور بلال مشرف کی ملاقات بالکل اہم نہیں، وہ دونوں کاروبارِ زندگی میں مصروف ہیں، اور اس بیماری کو صرف انسانیت کی خاطر نرمی حاصل کرنے اور ملک سے باہر نکلنے کے لئے

ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے''۔

ہم باتیں کرتے ہوئے القصباء کی تفریح گاہ میں پہنچ گئے، یہاں سمندر کے بیچ اس طرح پانی کا رخ موڑا گیا ہے کہ دونوں جانب گزر گاہ ہے اور درمیان میں پانی! یہاں جھولے بھی ہیں اور واکنگ ٹریکس بھی، دونوں جانب کے ٹریکس کو ملانے کے لئے اوور ہیڈ برج بھی، گزر گاہ کے کنارے پر بیٹھنے کے لئے بنچ بھی نصب ہیں، محسن ہمیں وہاں چھوڑ کر سائیکلنگ کرنے چلا گیا، ہم سمندر کے کنارے چہل قدمی کرنے لگے، یہاں لوگ بوٹنگ بھی کر رہے تھے۔محسن دس کلومیٹر سائیکل چلا کر واپس آیا تو ہاتھ میں ہمارے لئے آئس کریم تھی، باجی کے لئے ''شوگر فری'' اور ہمارے لئے پی نٹ وینیلا فلیور، محسن کی پسندیدہ آئس کریم جو وہ ہمیں کھلا کر خوش ہو رہا تھا۔ہم باتوں میں مگن تھے کہ ایک پریشان حال خاتون ادھر سے گزری، کچھ دور کھڑے لوگوں سے کچھ پوچھا، انہوں نے ایک جانب اشارہ کیا ،اور وہ تیز تیز چلنے لگی، ابھی کچھ دور بھی نہ گئی تھی کہ سمندر کے دوسری جانب سے ایک موٹے شخص نے اسے آواز دی اور اسکے پیچھے دوڑ لگا دی، اور کچھ آگے جا کر اوور ہیڈ برج کراس کر کے اسکے پیچھے بھاگا، ہماری آنکھوں میں خوف تھا، مگر باجی کا کہنا تھا کہ یہ ڈرامے یہاں آئے دن ہوتے رہتے ہیں، ہم کیا جانیں، ایمپلائے منٹ کا مسئلہ ہے یا کچھ اور!

یہ تھا ہمارا امارات میں شارجہ سے پہلا عملی تعارف! شارجہ، جو آٹھ لاکھ نفوس پر مشتمل متحدہ عرب امارات کی تیسری بڑی امارت ہے، جسکا رقبہ ۲۶۰۰ مربع کلومیٹر ہے، یہ ریاست تقریباً پانچ ہزار سے زائد برسوں سے آباد ہے، تاریخی اعتبار سے یہ شہر ہمیشہ متمول آبادی کا شہر رہا ہے، اسکے حاکم سلطان محمد بن القسیمی ہیں، جنکا خاندان ۱۷۲۷ء سے یہاں کا حکمران ہے، دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب متحدہ پاکستان میں دو بھائیوں کے اختلافات کا نتیجہ سقوطِ ڈھاکہ کی صورت میں نکل رہا تھا، اور مسلمان امت کا رواں رواں ان زخموں اور انکے الم کو محسوس کر رہا تھا، شارجہ کے شیخ خالد الثالث القسیمی نے شارجہ کا الحاق متحدہ عرب امارات سے کرلیا، بالکل ایسے ہی جیسے کائنات میں کوئی جیتا اور کوئی مرتا ہے، کہیں زندگی کا چراغ گل ہوتا ہے اور کہیں کلیاں چٹک کر پھول بن جاتی ہیں۔

(جاری ہے)

☆☆☆

بجنا اور بجانا

گاڑی بڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی کہ ایک خاتون نے اسے رکنے کا اشارہ کیا، ڈرائیور نے گاڑی روک کر پوچھا کہ بی بی کہاں جانا ہے؟ اس نے کہا، جانا تو کہیں بھی نہیں ہے، یہ بچہ رو رہا ہے، ذرا ہارن بجا دیں۔

بچہ تو خود چلتا پھرتا ہارن ہوتا ہے نہ جانے اس خاتون کو کیسے ہارن کے لئے ہارن بجانے کی ضرورت پڑ گئی۔ جبکہ مردوں کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے، جیسا کہ ایک شخص اپنے بچے کو سائیکل پر بٹھائے کہیں جا رہا تھا اور ساتھ ہی اسے مارتا جاتا تھا۔ کسی نے ماجرا پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ دراصل میرے سائیکل کے ساتھ ہارن نہیں ہے۔

بچہ اگر رونے لگ پڑے تو وہ سارے جگ کو سر پر اٹھالیتا ہے اور ہر کوئی اس باجے کو بند کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے لیکن یہ عجب معاملہ ہے کہ باجے کو باجہ ہی پسند ہوتا ہے اور اسے گھنٹیاں اور باجے بجانے ہی میں لطف محسوس ہوتا ہے، جیسا کہ ایک بچہ لپک لپک کر ایک مکان کی گھنٹی بجانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک بڑے میاں کو ترس آیا، انہوں نے گھنٹی بجادی، پھر بڑے پیار سے پوچھا، اب کوئی مسئلہ؟ بچے نے کہا اب بھاگ جائیں، ورنہ پٹائی ہو جائے گی۔

ہمارے ہاں بجانے کا عارضہ عمر کی قید سے آزاد ہے۔ اسمبلی میں ڈیسک بجانا ارکان کا مشغلہ ہوتا ہے کیونکہ بے چارے انگوٹھا چھاپوں اور جعلی ڈگری والوں کو اس کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔ پہلے پہل ڈھول باجہ تو ڈوم میراثیوں کا کام ہوتا تھا لیکن آج کل اس معزز پیشہ نے کافی ترقی کر لی ہے حتٰی کہ ہمارے ایک صدر صاحب بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ میرے والد ہارمونیم بجا لیتے ہیں اور والدہ پیانو بجاتی ہیں۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ اس فن نے ترقی کی ہے یا اس فن والوں نے ترقی کی ہے کہ وہ کہاں جا پہنچے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سیٹی بجانا شریفوں کا کام نہیں لیکن گارڈ، ریفری اور نوجوان میں یہ قدر مشترک ہے کہ وہ سیٹی بجاتے ہیں جب کہ بعض دفعہ اسی شغل میں نوجو

انوں کی اپنی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ سپیرے بین بجاتے ہیں جبکہ سیانوں کا کہنا ہے کہ بین ہمیشہ بھینس اور حکمرانوں کے سامنے بجائی جاتی ہے اور اکثر اوقات دونوں کا نتیجہ ایک جیسا نکلتا ہے تاہم اس میں بھینس کو ہم ذرا بھی قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے کیونکہ وہ بہر حال عقل سے بڑی ہوتی ہے۔

بانس کے دو ہی مصرف ہیں یا تو اس سے ڈنڈے بنائے جائیں یا پھر بانسری، لیکن فن کو میلی نظر سے دیکھنے والے ہمیشہ بانس کو ختم کرنے پر زور دیتے ہوئے نعرہ مستانہ بلند کرتے ہیں کہ نہ رہے بانس، نہ بجے گی بانسری۔ حالانکہ وہ یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ نہ رہے بانس، نہ برسیں ڈنڈے۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ بھلا ہم نے نیرو کو روم جلاتے وقت بانسری ہاتھ میں تھمائی تھی کہ میاں لو اس سے دل بہلاؤ۔ پہلے ہمارے ہاں بھی اذان بجا کرتی تھی، اب شکر ہے کہ ہونے لگی ہے۔ البتہ اب نعرے بجنے لگے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ نعرہ لگاتے ہوئے بھی یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں دے نعرے بجن گے۔

موبائل ایسی چیز ہے کہ جو اور کہیں بجے نہ بجے لیکن مسجد میں ضرور بجتی ہے، اور یہ نہ بجے تو بھلا کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ جناب کے پاس ایک عدد موبائل بھی ہے اور بسا اوقات تو یہ مسجد میں بارات کا سماں برپا کر دیتا ہے، ناہجار کہیں کا۔ پھر اس کے بعد اس نمازی پر باقی نمازی ایسا بجتے ہیں کہ اس جیسے کئی موبائلوں کو مات دے دیتے ہیں۔

ویسے تو ڈھول اور ڈھول سپاہیا میں یہ فرق ہے کہ ڈھول بجائی جاتی ہے جب کہ موئخر الذکر خود بجتا ہے، وہ بھی غریب عوام پر۔ کہتے ہیں کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں لیکن ہمیں آخر اس عمر میں سہانے سپنوں میں پڑنے کی بھلا کیا ضرورت ہے اور جب ڈھول کا پول کھل گیا تو پھر کیا ہوگا۔ خوشی کے موقع پر ڈھول اور غمی میں نقارے بجائے جاتے ہیں۔ بقول شاعر کہیں شہنائی بجتی ہے، کہیں ماتم ہوتا ہے۔ اور نقار خانے میں بھلا طوطی کی کون سنتا ہے۔ اب آپ خود ہی سوچیں کہ نقار خانے میں طوطی کو جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اور تو اور، گھڑی بھی بجنے لگی ہے اور اکثر پوچھا جاتا ہے کہ کیا بجا ہے؟ یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اتنے بج کر اتنے منٹ، تبھی تو بچے لہک لہک کے گاتے ہیں کہ گھڑی نے ایک بجایا۔۔۔ چوہا نکل کے آیا۔ اب آپ یہ بھی پوچھیں گے کہ دو بجانے پر بلی بھی نکلتی ہے

کہ نہیں، اس لئے ہمیں موضوع بدلنا ہی پڑے گا۔

کسی وقت تو ہم یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتے ہیں کہ ہر ایک کو آخر بجانے کا اتنا ذوق کیوں ہے؟ بادشاہوں کے لئے بگل بجا کرتے تھے اور اب ہوٹر بجائے جاتے ہیں۔ جب کہ غریب عوام بغلیں بجاتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی حاسد لوگ بغل میں چھری، منہ میں رام رام کی پھبتی کس دیتے ہیں۔ اسی طرح ہارن بجانا ڈرائیور حضرات کا بھی مشغلہ ہے اور پریشر ہارن بجانے میں جو لطف ہے اس کو کیسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ساغر نظامی جیسا شاعر بھی یہ کہہ اٹھتا ہے کہ:

؎ نغمے ہوا نے چھیڑے فطرت کی بانسری میں
پیدا ہوئیں زبانیں جنگل کی خامشی میں

باجا تو شاید کہتے ہی بجانے والی چیز کو (بعض باجی کے مذکر کو بھی باجا سمجھتے ہیں) لیکن شہنائی بھی تو بجتی ہے تو اس میں بجنا کہاں فٹ کریں گے۔ ہمیں ڈنکا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا (خدا وہ دن نہ لائے) لیکن کہتے ہیں کہ وہ کم بخت بھی بجایا جاتا ہے، کامیابی کا ڈنکا، شہرت کا ڈنکا، نیک نامی کا ڈنکا وغیرہ وغیرہ۔ کسی کی تائید کرنی ہو تو کہہ دیتے ہیں کہ بجا فرمایا آپ نے۔ جبکہ بعض کے بجنے سے بھیجا بھی باہر آ جاتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اگر بھیجا ہوتا تو ایسی بات وہ کرتا ہی کیوں؟

جس طرح کسی چیز کے بجنے کا اثر انسان قبول کرتا ہے اسی طرح موسم کا بھی اثر ہوتا ہے چنانچہ سردی سے دانت بجنے لگتے ہیں، لیکن گرمی سے کیا بجتا ہے اس بارے میں ہمارے ماہرین تحقیقات کر رہے ہیں۔

ہمیں آزادی رائے کے اس دور میں یہ بورڈ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہارن بجانا منع ہے، حالانکہ اگر کوئی ہارن بجا کر اس سے ہاتھ اٹھانا بھول گیا ہے تو یہ محض بشری کمزوری ہے اس پر بات کا بتنگڑ بنا دینا اور خواہ مخواہ کے چالان کرتے پھرنا اور معزز اور شریف شہریوں کو تنگ کرنا کونسا انصاف ہے۔ ویسے بھی عبارت میں یہ وضاحت تو ہے ہی نہیں کہ کتنی بار ہارن بجانا منع ہے۔

کہتے ہیں کہ برتن بھی ایک جگہ پڑے ہوں تو وہ ایک دوسرے سے بج جاتے ہیں، شاید اسی لئے بجانے والے کو بھانڈ کہا جاتا ہے تاہم یہ معاملہ بھی عجیب ہے

کہ عوام چند روپے کے برتن تو خوب ٹھوک بجا کر لیتے
ہیں لیکن نا اہل لوگوں کو کئی کئی سال کے لئے اپنے اوپر
سوار کر لیتے ہیں!!

☆☆☆

میری دادی جان

میری دادی جان، بیگم شیخ فقیر حسین صاحبہ مورخہ 20 اگست 2012ء بمطابق 28 رمضان المبارک 1433ھ اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔

انا للہ وانا الیہ رجعون

دادی اماں کی عمر وفات کے وقت نوے سال سے زائد تھی۔ وہ پانچ سال سے زائد عرصہ سے کافی علیل رہیں مگر ہوش وحواس میں تھیں۔ رمضان میں ان کی طبیعت کافی ناساز ہوگئی 22 رمضان المبارک کو انہیں منصورہ ہسپتال کے ICU وارڈ شفٹ کیا گیا، پانچ روز وہاں زیر علاج رہیں 28 رمضان المبارک سحر کے وقت سے تقریباً نصف گھنٹے قبل 2 بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔

دادی جان کی یادداشت آخری سال بہت زیادہ متاثر رہی لیکن بہت قریبی رشتہ داروں، عزیزوں کو فوراً پہچان لیتی تھیں۔ میں نے بارہا اس بات کا مشاہدہ کیا کہ وہ اپنے سسرالی خاندان سے یعنی اپنے دیوروں کے خاندان سے بہت زیادہ قلبی تعلق رکھتی تھیں۔ خصوصاً شیخ عاشق حسین جو داداجان کے چھوٹے بھائی تھے، کے خاندان سے حددرجہ محبت اور پیار کرتی تھیں۔ اپنی وفات سے چندروز قبل گھر میں دادی جان نے جو آخری الفاظ ادا کیے وہ ''میری ناصرہ'' (رکن جماعت اسلامی اور میری والدہ کی خالہ اور والد صاحب کی چچی جان) تھے۔ ناصرہ آپا گزشتہ پانچ چھ سال سے تقریباً ہر مہینے دادی جان کے پاس عیادت کے لئے آتی تھیں۔ ان کو بھی سب سے زیادہ قلبی لگاؤ میری دادی جان ہی سے تھا۔ ناصرہ آپا کا سب سے چھوٹا بیٹا فواد حسین سعودی عرب میں رہائش پذیر ہے، اس سال رمضان سے دو ماہ قبل اس نے اپنی والدہ کے لئے ویزہ اور ٹکٹ بھجوایا اور عمرہ وحج تک قیام کی دعوت دی جسے انہوں نے یہ کہہ کر واپس کروا دیا کہ ''میں اپنی ماں (خالہ) کو اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔''

ناصرہ آپا میری دادی اماں کو حقیقتاً اپنی ماں ہی سمجھتی تھیں کیونکہ ان کی اصل والدہ جو میری دادی اماں کی بڑی بہن تھیں، کی وفات کے بعد یہ چاروں بہن بھائی

میری دادی اماں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ میری دادی جان نے ہی ان کو پالا پوسا، جس کی وجہ سے ناصرہ آپا کا قلبی لگاؤ حد سے زیادہ تھا۔

داداجان[1] کو تو ہم نے نہیں دیکھا لیکن ان کے بارے میں بہت سی معلومات دادی اماں، تایا جان (عبدالرؤف اور عبدالغفور) اور باباجان (افتخار احمد)، منصورہ کے بہت سے مکینوں اور تحریکی خواتین سے حاصل ہوئیں۔ جناب حافظ محمد ادریس صاحب نے عزیمت کے راہی (حصہ چہارم) میں بھی داداجان کے بارے میں تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ میرے داداجان 1939 ہی سے مولانا مودودیؒ کے نظریات سے متاثر تھے۔ 1941ء میں جب جماعتِ اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی تو داداجان مرحوم اوران کے ایک بڑے بھائی اور ایک کزن جماعت کے تاسیسی اجتماع میں شریک ہوئے اور رکنیت اختیار کی۔ اس دور میں رکنیت اختیار کرنا آج کل کی رکنیت اختیار کرنے کے برابر نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب اپنی پوری برادری، خاندان حتیٰ کہ بیوی بچوں اور پورے معاشرے سے کٹ کر زندگی گزارنا تھا۔ قدم قدم پر آزمائشیں منہ کھولے کھڑی ہوتی تھیں، ایسے حالات میں دادی جان نے ہر موقع پر اور ہر مشکل گھڑی میں میرے داداجان کا ساتھ دیا۔

دادی اماں سے میں نے چند واقعات کی تفصیل جاننا چاہی تو انہوں نے بتایا کہ تمہارے داداجان اے جی آفس میں سروس کرتے تھے اور ایک محکماتی امتحان دینے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس امتحان کی کامیابی کی صورت میں داداجان کو سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ترقی ملنے کے پورے پورے امکانات تھے کہ اس دوران وہ سرکلرز سرکاری محکموں میں پہنچ گئے جن میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے ملازمین کو سرکاری ملازمت یا جماعت اسلامی دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا تھا، ایسے موقع پر داداجان نے سرکاری ملازمت پر جماعت اسلامی کی رکنیت کو ترجیح دی اور استعفیٰ لکھ کر آفس انچارج کو دے آئے۔ اگلے دن داداجان کو آفس بلایا گیا اور افسر نے کہا کہ ’’اس بات کا اقرار کرلو کہ میرا جماعت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں۔ تو میں سارا معاملہ خود ہینڈل کرلوں گا۔‘‘ لیکن داداجان نہ مانے اور کہا کہ ’’میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھتا ہوں اور میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔‘‘ اس نے کہا ’’اچھا! تم نہیں مانتے تو نہ سہی، ایسا کرتے ہیں کہ تحریر میں لکھ دیتا ہوں تم صرف دستخط کردینا۔‘‘ داداجان مرحوم اس پر بھی

نہ مانے اور مضبوط ارادے لے کر آفس سے نکل آئے۔
[illegible] احسن اصلاحی اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ دادا جان کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور بدنام زمانہ شاہی قلعے میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ پولیس کے تفتیشی افسران دادا جان سے صرف ایک سوال کرتے کہ بتاؤ جماعت کو امداد کہاں کہاں سے ملتی ہے اور کون لوگ اسے فنڈز مہیا کرتے ہیں اور یہ بھی کہ امریکہ سے جماعت کو کتنی امداد ملتی ہے۔ دادا جان کا ایک ہی جواب ہوتا کہ مالیات کے رجسٹر آپ حضرات کے قبضے میں ہیں ان میں تمام تر تفصیلات موجود ہیں، وہاں سے دیکھ لیجیے۔ اس جواب پر وہ لوگ اور زیادہ تشدد کرتے۔

میری دادی اماں پاکستان بننے سے پہلے کے واقعات ، دادا جان کی جماعت اسلامی کے تاسیسی اجلاس میں شرکت اور ان کی مولانا مودودیؒ کے ساتھ ملاقاتوں کا تذکرہ اور بے شمار دوسرے واقعات سناتی تھیں۔

وہ ایک واقعہ بیان کرتی تھیں کہ شیخ صاحب کی مولانا مودودیؒ کے ساتھ بے تکلفی تھی۔ عید الفطر کے ایک موقع پر دادا جان نے مولانا صاحب کو گھر پہ شیرینی کی دعوت دی۔ مولانا مودودیؒ نے اس دعوت کو بخوشی قبول کیا۔ مولانا صاحب نے مسجد میں موجود جتنے رفقاء بھی ان کے پاس کھڑے تھے، سب کو کہہ دیا کہ آئیے آئیے! آج شیخ صاحب کے گھر شیرینی کی دعوت ہے۔ راستے میں بھی جماعت کے کچھ اور رفقاء مزید ملتے گئے مولانا ان کو بھی ہمراہ لے آئے۔ میرے دادا جان دل ہی دل میں پریشان ہوئے کہ اتنے زیادہ افراد کے لئے بیٹھنے اور شیرینی کا انتظام کیسے ہوگا؟ اور مولانا بھی کن اکھیوں سے دادا جان کو پریشان دیکھ کر مسکرا رہے تھے، وہ میری دادی اماں کے پاس آئے اور کہا کہ گھر میں جتنی شیرینی ہے ساری لے آؤ۔ میری دادی اماں بتاتی ہیں کہ میں نے کچھ شیرینی ہمسائیوں سے منگوائی۔ اس طرح عید کا وہ دن ہم نے گزارا اور مولانا صاحب نے بھی جاتے ہوئے کہا شیخ صاحب! عید منانے کا صحیح لطف تو آج آیا ہے۔

میری دادی اماں کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا غم میں نے اپنے والد کی آنکھوں میں بہت شدت سے دیکھا، مجھے اس روز ایسا محسوس ہوا کہ شاید ان کا کسی اور کے ساتھ اتنا لگاؤ نہ تھا، جتنا میرے والد صاحب کے لئے تھا کیونکہ میری دادی اماں شروع ہی سے میرے بابا کے ساتھ رہتی تھیں، اور میرے بابا ان کے کھانے اور ان

کی دوائیوں اور دیگر ضروریات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ میرے بابا اپنی تمام مصروفیات کے باوجودرات کو کافی دیر تک اپنی والدہ کو وقت دیتے۔ ان سے باتیں کرنے اور ان سے نظمیں ،نعت اور اشعار وواقعات سنتے۔

چونکہ دادی اماں ہمارے پاس ہی رہتی تھیں، اس لیے سب مہمانوں کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہمارا گھر ویران وسنسان اورسونا سونا ہے، اور گھر کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ دادی اماں کی آوازیں جب وہ ہمیں کسی کام کے لئے بلاتیں اور پیار اور شفقت سے بار بار بلاتیں، وہ آوازیں جو ہر طرف ہمارے گھر میں گونجتیں۔ آج ان صداؤں کی کمی محسوس ہورہی تھی!

مجھے اپنی دادی اماں کی وفات پر ایسے محسوس ہوا کہ جیسے ہمارے لیے دعاؤں کا ایک در بند ہو گیا ہو! ان کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہمارے لیے ان کے منہ اور دل سے نکلتی ہوئی دعائیں لمحہ بہ لمحہ یاد آتی ہیں۔ وہ ہمارے لیے ہمارے مستقبل کے لئے، ہماری تعلیمی ترقی کے لئے، ہماری والدہ کیلئے ہمارے والد صاحب کے ساتھ مل کر لمبی دعا کیا کرتی تھیں اور ہر دعا کے بعد ہم لوگ آمین کہتے۔ جب کبھی ہمارے امتحان ہوتے، ہم دونوں بہنیں سب سے پہلے دادی اماں سے دعا لے کر گھر سے نکلتے، اور جب امتحان دے کر ہم گھر واپس آتے تو سب سے پہلے دادی اماں ہم سے پوچھا کرتیں بتاؤ! آج پرچہ کیسا ہوا؟ اور ہم دادی اماں کو خوشی خوشی اپنے پرچے کی روداد سناتے اور پھر دوبارہ وہ ہماری کامیابیوں کے لئے ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتیں۔

ان کی دعاؤں کا اثر میں واقعتاً اپنی زندگی میں محسوس کرتی رہی۔ ان کی کمی اور ان کی دعاؤں کی کمی آج ہی نہیں بلکہ اب تو ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی!! بڑے بوڑھوں، بزرگوں سے آباد گھروں کی رونقیں ہوتی ہیں اور گھر میں ان کی بدولت جو برکتیں ہوتی ہیں ان کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری دادی اماں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور میرے باباجان اور میری امی کی ان خدمات کو، جو انہوں نے دادی اماں کی بیماری اور علاج ومعالجے کے لئے کیں ان کو قبول فرمائے (آمین)

☆☆☆

وقت زندگی ہے

ایک کو فیاضی سے نوازا ہے۔کوئی انسان جو دنیا کے کسی خطے میں موجود ہے، اس کے پاس چوبیس گھنٹے موجود ہیں، ایک امیر کے پاس بھی اور غریب کے پاس بھی۔ایک امریکی اور افریقی کے پاس بھی، ایک جوان اور معمر کے پاس بھی یہی دن رات کے متعین اوقات ہیں جن کو اگر کوئی چاہے تو بہترین اندز سے، محنت اور منظم طریقے سے اپنے لیے مفید اور کار آمد بنا سکتا ہے، بالکل اسی طرح اگر کسی نے تیزی سے گزرتے وقت سے غفلت اختیار کی تو یہ بہترین سرمایہ، اس کے ہاتھ سے ہوا ہو جائے گا کیونکہ ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔''

ایک بار کسی مریض کا آپریشن ہوا، مریض بے ہوش تھا، اس کے رشتہ دار اس کی صحت اور زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ڈاکٹر روم میں داخل ہوا تو اس نے کہا ''امید ہے کہ یہ ہوش میں آجائیں گے، آپ لوگ دعا کریں۔ایسے سیریس مریض میں ففٹی ففٹی چانس ہوتا ہے۔اگر اب ان کو ہوش آگیا تو سمجھیں انہیں نئی زندگی مل گئی، ورنہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔یہ کہہ کر ڈاکٹر نے فائل اٹھائی اور کمرے سے نکل گیا۔بیم ورجا کے عالم میں، سب نے سچے دل سے اپنے رب کو پکارا۔اس لیے کہ اب صرف ایک اس کا ہی آسرا تھا۔ رب تعالیٰ نے یہ پکار سن لی اور یکا یک مریض نے بند آنکھیں کھول دیں۔تو سب چہروں پر شکر گزاری اور رونق آگئی کہ اس رب نے دعا قبول کر لی تھی۔تو یہ وقت کیا ہے، ایک وقت مقرر، ایک مہلت، اور وقت، زندگی ہے۔جب وقت مل گیا تو زندگی مل گئی۔

وقت، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا دیا ہوا بہترین تحفہ ہے اور اس تحفے کی جتنی بھی شکر گزاری کریں، حق ادا نہ ہوگا۔اس تحفے کو آپ دوسروں میں بھی بانٹ سکتے ہیں۔کسی کے کام آکر۔کسی کی خدمت کر کے، کسی کی خوشی غمی میں اس کا ساتھ دے کر اور کسی کو نیکی کا روشن راستہ دکھا کر۔نیکی کے کاموں میں وقت لگانا بہترین انویسٹ منٹ (سرمایہ کاری) ہے، جو بعد میں ہمیشہ کی زندگی کی صورت میں لوٹائی جائے گی۔اسی طرح کسی کی

غلطی معاف کرکے اسے مہلت دے دینا یا کسی قرض دار کو قرضہ لوٹانے میں، مزید وقت دینا بھی عظیم نیکیاں ہیں۔اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں لیکن نیکی تو یہ ہے کہ جس مالک نے وقت عطا کیا ہے، اس وقت کو رب تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارا جائے اوراس کے دین کی اشاعت اور فروغ کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ حضرت جنید بغدادیؒ، وقت اور احتساب کے بارے میں فرماتے تھے کہ ''تم ہر لمحہ یہ دیکھتے رہو کہ اللہ سے کتنے قریب ہوئے، شیطان سے کتنے دور ہوئے، جنت سے کتنے قریب ہوئے اور دوزخ سے کتنے دور ہوئے۔''

بقول اقبال

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

معروف مصنف ڈیل کارنیگی لکھتا ہے:

''کام کرنے کا وقت ابھی ہے اور یہی لمحہ ہے جو آپ کی کامیابی کی ڈور کا سرا پکڑ سکتا ہے۔ لہٰذا ابھی سے اپنے کام کا آغاز کریں۔''

ایک حقیقت شناس انسان کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے کاموں کا باقاعدہ منصوبہ بنا کر، ترجیحات سامنے رکھ کر، تقسیم اور ترتیب کرتا ہے، قلیل المیعاد اور طویل المیعاد کاموں کا لائحہ عمل تیار کرتا ہے اور پھر قدم بہ قدم ان کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ ان کاموں کی تکمیل کے لئے رب کریم سے دعائیں بھی مانگتا ہے کہ کوشش انسان کا فرض ہے اور انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

فی زمانہ، وقت کی کمی کی شکایت عام ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو وقت کم کرنے کے کافی حد تک ذمہ دار ہم خود ہی ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے زندگی گزارنا، بغیر مشورے اور رہنمائی کے کوئی کام شروع کر دینا، وقت اور کام کی ماہیت میں توازن نہ ہونا، طبیعت کی سستی اور آج کا کام کل پر ٹالنا، اپنی طبیعت کا مدوجزر، ماحول کے دباؤ میں اپنی ترجیحات کو پیچھے چھوڑ دینا، دوسروں کی حوصلہ شکنی کے رویے ہر دل چھوڑ بیٹھنا، فون، ٹی وی اور انٹرنیٹ کا بہت غیر ضروری استعمال کرنا، انتظار کی گھڑیوں میں کچھ اور کام نمٹانے کی طرف نہ سوچنا، ہر کام کو اس کی اہمیت اور انجام مدنظر رکھ کر نہ کرنا بلکہ من موجی کا رویہ رکھنا۔ یہ چند عوامل ہیں جو ہمارا وقت، قیمتی سرمایہ زندگی کھا جاتے ہیں۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ وقت جتنا اہم آپ

کے لیے ہے، اتنا ہی وہ دوسروں کے لئے بھی اہم ہے۔ دانش مند لوگ ایسے امور سے اجتناب برتتے ہیں جن سے اپنا یا کسی دوسرے کا وقت ضائع ہو۔ مثلاً کسی رشتہ دار، عزیز کے گھر جانا ہو تو اس کو اطلاع دے کر جایا جائے تا کہ وہ بھی مہمانوں کو اچھی میزبانی دے سکے۔ اگر دوران سفر کہیں گاڑی پارک کرنی پڑے تو جلدی میں آڑی ترچھی، پارک کر کے نہ چلے جائیں جو کسی دوسرے کے راستے کی رکاوٹ بن جائے یا ایک غلط پارکنگ سے ٹریفک جام کی نوبت آئے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی کتنی جلدی میں ہو، یا کسی ایمرجنسی میں جلد پہنچنا چاہتا ہو۔ آپ کی ذرا سی لاپروائی سے کسی کا بڑا نقصان ہوجائے۔

ہمارا دفتری نظام جو فائلوں اور دستخطوں میں پروان چڑھتا ہے، وہ سائلین کو بہت مشکلات کا نشانہ بنا دیتا ہے، کلرک حضرات کی بادشاہی، آج فلاں مہر لگوا کے لائیں، کل فلاں فارم لائیں، پرسوں اس کی تصدیق کروائیں، اگلے دن فلاں فیس جمع کروائیں، کوئی ان بھائیوں سے پوچھے کہ ایک ہی بار سارا کام کیوں نہ بتا دیا کہ لوگ پھیرے کاٹنے سے بچ جاتے!

عدالتی نظام کو دیکھیں تو اور اذیت ناک صورت حال ہے۔ مقدمات سالہا سال چلتے ہیں۔ کچھ التوا میں پڑتے رہتے ہیں۔ پیشیاں بھگتاتے بندہ، دنیا سے چلا جاتا ہے، مگر کیس کا فیصلہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ حالانکہ مشہور مقولہ ہے۔

''Justice delayed is justice denied!''

(انصاف میں تاخیر کرنا، انصاف سے انکار کرنا ہے!)

سورہ والعصر، جس میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے، اس کے بارے میں مفسر قرآن، ابن کثیر کہتے ہیں کہ ''اگر لوگ صرف اسی سورہ میں تدبّر کر لیتے تو یہی ان کے لیے کافی تھی!''

(یعنی صرف وہی لوگ دیوالیہ ہونے سے بچ گئے ہیں جنہوں نے ایمان، عمل صالح کے ساتھ ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور صبر کی وصیت کی ہے)

مقام غور و فکر ہے کہ ہمارا اسلامی کیلنڈر کیسے تشکیل پایا؟

حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جب اسلامی کیلنڈر کی ضرورت محسوس ہوئی تو پہلی اسلامی مملکت کی بنیاد بننے والے عمل عظیم یعنی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ہجرت کو اتنی اہمیت دی گئی۔ ہجرت کیا ہے؟ یہ صرف

ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا نہیں ہے بلکہ اپنے اللہ کی خاطر، اس جگہ کو چھوڑنا جہاں اس کی نافرمانی ہوتی ہو، اور اس جگہ چلے جانا، جہاں رب کی اطاعت وفرمانبرداری ہوتی ہو، اوراس جگہ چلے جانا، جہاں رب کی اطاعت وفرمانبرداری میں زندگی بسر ہوسکے۔ یہ ہجرت کی روح ہے اور گناہوں کو چھوڑنا، اعمال صالح کا خوگر بننا، یہ باطنی ہجرت ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا ہم نے ایسی ہجرت کی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے ہمیں آگاہ کردیا ہے:

ترجمہ: ''قریب آلگا لوگوں کے لئے ،اُن کے حساب کا وقت اور وہ غفلت میں پڑے، (اسکی تیاری سے) روگردانی اختیار کیے ہوئے ہیں!''

(الانبیاء-1)

☆☆☆

تبصرہ کتب

نام کتاب: اربعین للنساء

مصنفہ: پروفیسر ثریا بتول علوی

صفحات: 142

قیمت: 160 روپے

ملنے کا پتہ: 106۔حبیب پارک، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

''اربعین'' یوں تو عربی زبان میں چالیس کے عدد کے لیے بولا جاتا ہے لیکن یہ اصطلاح چالیس احادیث کے مجموعے کے لیے اتنی مشہور ومعروف ہے کہ صرف اربعین کہنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث کی کوئی کتاب ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کو یاد کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی تھی اور ''چالیس احادیث'' کے حفظ کی ایک معروف روایت بھی اسی حوالے سے عوام میں مشہور ہے، چنانچہ بڑے بڑے محدثین کرام نے بھی چالیس حدیثوں کے مجموعے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مرتب کیے۔ بعض نے کسی خاص موضوع پر احادیث جمع کیں اور بعض میں ایمانیات، عبادات اور معاملات، سب کی جامع احادیث شامل کی گئیں۔ کچھ اربعین کے مجموعے تو اتنے مشہور ہوئے کہ ان کی کئی کئی شرحیں لکھی گئیں مثلاً اربعین نووی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ارشادات سے محبت کی اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے دینی اور علمی حلقوں کی معروف شخصیت، محترمہ پروفیسر ثریا بتول علوی صاحبہ نے بھی ''اربعین للنساء'' یعنی خواتین کے لیے چالیس حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا نام اگرچہ انھوں نے اربعین ہی رکھا ہے لیکن دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک جامع حدیث کو عنوان (حدیث الباب) بنا کر انھوں نے اس کی ذیل میں کئی تشریحی اور توضیحی احادیث اردو میں درج کر دی ہیں۔ اسے دیکھ کر قرآن مجید میں بیان کردہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بے اختیار یاد آ جاتا ہے جب انھیں اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف یہی نہیں

بتایا کہ یہ میرا عصا ہے بلکہ جواب میں کئی باتیں بتائیں کہ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں، بکریاں ہانکتا ہوں اور، بہت سے اور کام بھی لیتا ہوں۔ مفسرین اس قصے کی دلچسپ بات یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ ؑ اللہ تعالیٰ سے زیادہ باتیں کرنا چاہتے تھے، چنانچہ جواب لمبا کر دیا۔ ثریا بتول صاحبہ کا ''اربعین'' کا مجموعہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ چالیس نہیں، تین چار سو سے زیادہ احادیث اس میں شامل نظر آ رہی ہیں۔ ''زبانِ غیر سے شرح آرزو'' کی بجائے، مصنفہ نے حدیث کی حدیث سے شرح کا بڑا مفید اسلوب اپنایا ہے۔

تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کی یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''عورت بحیثیت مسلمان'' ہے جس میں عقائد، عبادات اور جامع اعمال خیر سے متعلق احادیث شامل ہیں۔ تشریحی احادیث کے علاوہ احکام ومسائل کے عنوان سے اہم عملی نکات کی وضاحت کی ہے۔ احکام وآداب نماز، زکوٰۃ اور صدقہ کی ضرورت اور اہمیت، رمضان کے روزے، حج بیت اللہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بطور لازمی تقاضائے ایمان، حسن ادب، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور رزق حلال وغیرہ اس باب کے اہم عنوانات ہیں۔ مصنفہ نے بڑے اہم تشریحی نکات ان احادیث کی ذیل میں بیان کیے ہیں۔ مثلاً دس درہم کی ایک قمیض میں ایک درہم بھی حرام آمدنی کا شامل ہوگا تو جب تک یہ قمیض جسم پر ہے نہ نماز قبول ہوگی نہ دعائیں۔ رزقِ حرام اولاد کی نافرمانی اور گھریلو پریشانیوں کا سبب ہے اور کہیں یہ ہدایات بھی ملتی ہیں کہ کس طرح کی ملازمتیں اور کاروبار حرام ذرائع آمدنی میں شامل ہیں۔

باب دوم سے یہ اربعین خاص طور پر عورتوں کے احکام ومسائل کی وضاحت کی طرف رخ کرتی ہے۔ عورت کی بحیثیت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی عزت، حقوق وفرائض اور عصر نو کے چیلنج کے حوالے سے اہم ترین حکم ۔۔۔ یعنی مردوں پر گھر کی خواتین کے مالی فرائض کے علاوہ، تربیت کے اہم ترین فریضے کی طرف توجہ دلائی گئی۔

تیسرے باب میں عائلی زندگی کے بارے میں احادیث مبارکہ سے جو رہنمائی ملتی ہے، اس کو جمع کیا گیا ہے۔ نکاح میں عورت کی رضامندی اور ولی کی اجازت وغیرہ جیسے اہم مسائل زیرِ بحث ہیں۔ ہمارے معاشرے میں سرپرستوں کو نظر انداز کرکے، کورٹ

میرج کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ سے ایسی دینی رہنمائی ضروری تھی۔ شادی بیاہ کے اخراجات ، مہر، ولیمہ، اور شادی کے بعد کی ذمہ داریوں کے حوالے سے جامع احادیث اور اہم احکام و مسائل بڑی خوبی سے اور بڑے عالمانہ انداز میں (لیکن سادہ الفاظ میں) بیان کیے گئے ہیں۔ چوتھا باب طلاق، خلع، عدت اور نکاح ثانی کے حوالے سے اہم رہنمائی دیتا ہے۔

تیس صفحات پر مشتمل آخری باب بھی اہم ہے جس میں معاشرتی امور سے متعلق اہم احادیث ''سیرت و کردار'' کے عنوان سے جمع کی گئی ہیں۔ شرم و حیا، ستر و حجاب، لباس اور زینت کے احکام اور مردوں جیسا لباس ، نمایاں عنوانات ہیں۔ غالبًا اس وقت اسلامی تہذیب کے لیے سب سے بڑا چیلنج معاشرت اور ثقافت کے اسی میدان میں ہے۔ بلاشبہ اسلام نے کپڑے کا کوئی خاص مواد (Stuff) یا تراش خراش کا کوئی خصوصی انداز (Style) ہم پر لازم نہیں کیا لیکن لباس کے ساتر ہونے اور بعض دیگر لازمی ہدایات کی موجودگی میں ''اسلامی لباس'' اپنی کسی بھی وضع میں بڑا نمایاں ہوتا ہے۔ مؤلفہ چونکہ طالبات کے کالج میں استاد رہیں، چنانچہ اس حوالے سے روزمرہ لباس میں بچیوں اور خواتین کی طرف سے اختیار کردہ بے اعتدالیوں سے بخوبی واقف ہیں اور احکام و مسائل اور احادیث کے انتخاب میں انھوں نے اس طرف بڑی دردمندی سے توجہ دلائی ہے۔ البتہ ص 124 پر ایک جملہ محل نظر ہے۔ ''عورت ، مرد کی طرح پتلون یا تنگ لباس نہ پہنے۔۔۔۔۔'' غالبًا مراد یہ ہے کہ مردوں کی طرح پینٹ نہ پہنے ورنہ تنگ لباس (مثلاً تنگ جینز وغیرہ) مردوں کے لیے بھی اسی طرح مناسب نہیں جس طرح عورتوں کے لیے ایسے چست لباس مناسب نہیں ہیں۔

اس آخری باب میں زہد و قناعت، احکام میت اور سوگ وغیرہ، مرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے حصول کا طریقہ اور اخروی کامیابی کے بارے میں احادیث سے رہنمائی کرتے ہوئے کتاب کا بڑا مؤثر اختتام کیا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے حدیث نبوی صلی اللہ علی وسلم سے مؤلفہ کی محبت اور ذوق و شوق جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ امید ہے کہ حسن نیت سے لکھی گئی یہ کتاب اس محبت کی جوت قارئین کے دلوں میں بھی جگانے کا باعث بنے گی۔ قرآن مجید اور حدیث نبوی کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اس کا تھوڑا سا بھی ذوق پیدا ہوجائے (یا اس ذوق کے پیدا کرنے کی تھوڑی سی

کوشش کرلی جائے) تو جو سوز و گداز، جو تاثیر اور آمادۂ عمل کرنے کی جو صلاحیت ان دونوں میں ہے اور کہیں نہیں۔ ذوق ہو تو کلامِ الٰہی اور کلام نبویؐ کی صحبت سے بڑھ کر پر لطف کوئی اور صحبت نہیں۔

انتہائی مفید، بہت مختصر، جامع اور آسان زبان میں مرتب کردہ یہ مجموعہء حدیث ہر خاتون تک پہنچنا چاہیے۔ ہو سکے تو مہم بنا کر، مثلاً رمضان المبارک میں ایک دوسرے کو ہدیہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح خواتین کے حلقہء درس میں کسی ایک عنوان کا مطالعہ پیش کیا جا سکتا ہے جو ان شاء اللہ بڑی اہم دینی رہنمائی کا ذریعہ بنے گا۔

☆☆☆

روزہ اور انسانی صحت

روزہ جہاں انسان کی روحانی ارتقا کیلئے مفید ہے وہاں انسانی صحت پر بھی اس کے اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔لیکن یہ بات ابتداء ہی میں سمجھ لینی چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اعمال کے نتائج کا انحصار نیتوں پر ہوتا ہے۔ایک مومن روزہ اس لیے رکھتا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور رمضان کے روزے فرض ہیں،اور اُسے اللہ کی اطاعت بہرحال کرنی ہے۔ یہی حال شریعت کے دوسرے احکام کا ہے۔کسی حکم کی مصلحت ہمیں نظر آئے یا نا آئے ہم نے اس کو اس لیے بجالانا ہے کہ ہم اللہ کے بندے اور غلام ہیں اور اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی نجات کیلئے یہی ایک راستہ ہے۔لیکن یہ بات بھی ہر مومن کے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں صرف اعمال حسنہ کا ہی حکم دیا ہے جو ہمارے لیے اس دنیا کی زندگی میں بھی مفید ہیں، اور جیسا کہ سورہ ملک میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے موت اور زندگی کو اس لیے بنایا ہے کہ ہم یہ آزمائش کرنا چاہتے ہیں کہ تم انسانوں میں سے اعمال حسنہ کو کون اختیار کرتا ہے۔ذیل میں روزہ کے طبی فوائد بیان کیے جا رہے ہیں لیکن اگر کوئی شخص روزہ اس لیے رکھے کہ اُسے یہ طبی فوائد حاصل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے اس عمل کی کوئی قیمت نہیں ہوگی۔اور اگر کوئی یہ نیت کرے کہ روزہ رکھنے سے طبی فوائد بھی حاصل ہوں گے اور اللہ کا حکم بھی پورا ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ملاوٹ بھی قابل قبول نہیں، اللہ کی اطاعت خالصتاً اللہ کی اطاعت کی نیت سے ہی کی جائے گی تو قبول ہوگی۔

☆انسان کو کتنا کھانا چاہیے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ’’انسان کیلئے اس کے معدہ سے بدتر اور کوئی برتن نہیں جسے وہ بھرتا ہو۔انسان کیلئے چند لقمے ہی اس کیلئے کافی ہیں کہ اس کی کمر سیدھی رہے۔لیکن وہ اگر اپنا معدہ بھرنا ہی چاہتا ہے تو پھر اسے اس کو تین حصوں میں تقسیم کر لینا چاہیے، ایک حصہ ٹھوس غذا سے بھر لے اور ایک حصہ پانی سے اور تیسرا حصہ خالی رہنے دے تا کہ سہولت سے

سانس لے سکے۔''

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ انسان کا معدہ جب پوری طرح بھرا ہوا نہ ہوتو اس کے ایک حصے میں ہوا موجود رہتی ہے جو سانس لینے کے عمل کے دوران پھیپھڑوں کے پھیلنے میں سہولت پیدا کرتی ہے۔لیکن اگر معدہ ٹھونس کر بھرلیا جائے تو یہ ہوا اس میں سے نکل جاتی ہے اور سانس لینے میں دِقت پیش آتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معدہ کے اس خالی حصے کی جو افادیت بتائی ہے وہ آج تک کسی بھی فزیالوجی کی کتاب میں بیان نہیں کی گئی۔

یہاں اس حدیث کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ عام طور پر لوگ روزہ تو رکھتے ہیں لیکن افطاری کے بعد انواع واقسام کے کھانوں سے اپنے معدہ کو اس طرح ٹھونس کر بھرتے ہیں کہ روزہ کے طبی فوائد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ روزہ انسان کو اپنی صحیح ضرورت سے زیادہ نا کھانے کی تربیت دیتا ہے۔ تا کہ یہ عادت رمضان گذرنے کے بعد بھی جاری رہے۔ بسیار خوری کئی مہلک امراض کا سبب بنتی ہے جن میں ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، دل کی بیماری، فالج اور جوڑوں کا درد قابل ذکر ہیں۔

آج سے چودہ سو برس پہلے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں جا کر آباد ہو گئے تو دو حکیم مدینہ میں اس غرض سے آئے کہ اس نئی نشو ونما پانے والی ریاست میں اپنا کاروبار جمائیں لیکن کافی دن گذر گئے ان کے پاس کوئی مریض نہ آیا۔ انہوں نے اپنا بوری بستر سمیٹا اور جانے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور سارا ماجرا سنایا۔اس پر حضورؐ نے ان سے فرمایا:

نَحْنُ قَوْمٌ لَّانَأْكُلُ حَتّٰى نَجُوْعَ وَاِذَا اَكَلْنَا فَلَا نَشْبَعُ

(ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اس وقت تک نہیں کھاتے جب تک ہمیں بھوک نہ لگے اور جب کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے)۔

☆ **بھوک کی بحالی**

بعض نفسیاتی امراض میں انسان کی بھوک مرجاتی ہے۔اس کی وجوہات میں ذہنی دباؤ، پژمردگی، ملال، پریشانی اور depression وغیرہ شامل ہیں۔اس حالت میں انسان غذا سے رغبت کھو دیتا ہے،اور عام طور پر پانی اور دیگر مشروبات سے معدہ بھرتا رہتا ہے۔روزہ رکھنے سے جب بارہ چودہ گھنٹے معدہ خالی رہتا ہے اور پانی بھی

معدہ میں نہیں جاتا تو افطار کے وقت ایسے شخص کی بھوک چمک اُٹھتی ہے اور وہ غذا کی طرف رغبت محسوس کرتا ہے اور کھانے میں لذت محسوس کرتا ہے اس سے اس کی نفسیاتی کیفیت میں بھی بہتری آتی ہے۔ مہینہ بھر روزانہ یہ عمل جاری رہنے سے اس کی صحت بحال ہو جاتی ہے اور وہ رمضان گذرنے کے بعد بھی اپنی معمول کی غذا لینا شروع کر دیتا ہے۔

☆ رعشہ اور دماغی کمزوری سے بچاؤ

جدید تحقیق کی رُو سے انسان کے کھانے کے اوقات کا بھی اس کی صحت پر اثر پڑتا ہے، آج کل یہ رواج ہے کہ لوگ دن میں بار بار کھاتے ہیں۔ علی الصبح چائے کی پیالی، پھر ناشتہ، دس بجے کی چائے، دوپہر کا کھانا، شام کی چائے اور رات کا کھانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بار بار کا کھانا انسانی صحت پر بُرے اثرات ڈالتا ہے۔ انسان جب بھی کچھ کھاتا ہے تو اس کے جسم کے اندر اس غذا کو جزو بدن بنانے اور صرف کرنے کا عمل تیز ہو جاتا ہے یعنی اس کا BASAL METABOLIC RATE-BMR بڑھ جاتا ہے اس کے نتیجے میں ایسے کیمیاوی اجزا جنہیں OXIDANTS کہا جاتا ہے جسم میں زیادہ مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان اجزاء کی مسلسل بہتات رعشہ اور دماغی کمزوری اور بڑھاپے کے جلد وارد ہونے کا سبب بنتی ہے۔ رمضان میں یہ بار بار کھانے کی عادت چھوٹ جاتی ہے اور اگر اس پر بعد میں بھی عمل کیا جاتا رہے تو انسانی صحت پر بہت اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

☆ خون میں اِنسولین کی مقدار میں کمی

روزہ کے دوران خون میں شوگر کی مقدار میں کمی واقع ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں لبلبہ سے انسولین کی کم مقدار خون میں شامل ہوتی ہے۔ اس کے درج ذیل اہم فائدے ہیں۔

(الف) موٹاپے میں کمی، یہ بات معلوم ہے کہ خون میں انسولین کی زیادہ مقدار موٹاپے کا سبب بنتی ہے خصوصاً پیٹ اور کولھوں کا موٹاپا، روزہ کے دوران انسولین کی کمی سے موٹاپا کم کرنے میں مدد ملتی ہے اور موٹاپے سے پیدا ہونے والی بیماریوں مثلاً بلڈ پریشر، ذیابیطس، دل کی بیماری، فالج، جوڑوں کا درد سے بچا جا سکتا ہے۔

(ب) خون میں انسولین کی زیادہ مقدار براہ راست بھی ہائی بلڈ پریشر کا موجب بنتی ہے۔ اس کی کمی سے اس بیماری پر کنٹرول کرنے میں مدد ملتی ہے یعنی

انسولین بلڈ پریشر پر دوطرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ موٹاپے کے ذریعے سے بھی اور براہِ راست بھی۔ اس کے علاوہ روزہ رکھنے کی وجہ سے غذا کی مقدار میں کمی خصوصاً نمکیات اور چکنائی میں کمی بھی بلڈ پریشر کی بیماری پر اچھے اثرات ڈالتی ہے۔

☆ **نظام ہضم پر روزے کے مفید اثرات**

(الف) معدہ کے حجم میں کمی۔ اکثر لوگ جو موٹاپے کا شکار ہوتے ہیں ان میں بسیار خوری کی وجہ معدہ کا بڑا حجم ہوتا ہے۔ جب تک زیادہ مقدار میں غذا کھا کر معدہ بھر نہ لیا جائے ان کی سیری نہیں ہوتی۔ ترقی یافتہ ممالک میں آج کل ایسے لوگوں کا اپریشن کر کے معدہ کا ایک حصہ کاٹ کر نکال دیا جاتا ہے تاکہ معدہ کا حجم کم ہو جائے اور کم مقدار غذا سے ہی ان کی بھوک مٹ جائے۔ رمضان میں مسلسل ایک ماہ روزے رکھنے کے بعد بھی جب معدہ زیادہ وقت خالی رہتا ہے تو اس کے حجم میں کمی آجاتی ہے اور تھوڑی غذا ہی ایسے لوگوں کیلئے کافی رہتی ہے۔ لیکن اس کا مستقل فائدہ تبھی ہوگا اگر رمضان کے بعد بھی کم غذا کھانے کی عادت برقرار رہے۔

(ب) بڑی آنت میں ہوا کا رُکنا۔ بعض مریضوں کی بڑی آنت (COLON) کے دائیں اور بائیں دوکونوں (FLEXURES) میں ہوا رُک جاتی ہے، اور وہ اس سے درد محسوس کرتے ہیں جو کہ بعض اوقات بہت شدید صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ مسلسل روزے رکھنے سے ہوا کا اس طرح رُکنا ختم ہو جاتا ہے اور مریض آرام محسوس کرتا ہے۔

(ج) قبض کا رفع ہونا۔ روزہ کے دوران دن بھر معدہ خالی رہنے کی وجہ سے انتڑیوں کی حرکت سست پڑ جاتی ہے اور شام کو افطاری کے وقت جب غذا خالی معدہ میں داخل ہوتی ہے تو اس کے اثر سے بڑی آنت میں یکا یک تیز حرکت پیدا ہوتی ہے اور اس سے قبض کی تکلیف میں کمی آجاتی ہے۔

(د) معدہ کا زخم۔ULCER۔ جسم کے کسی حصے پر اگر زخم ہو جائے تو اس کو جلد مندمل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس حصے کو حرکت سے بچایا جائے۔ یہی حال معدہ کے زخم کا بھی ہے روزے کے دوران معدہ میں غذا نہ ہونے کی وجہ سے اس کی حرکت میں سستی آجاتی ہے، اور اس دوران زخم کے مندمل ہونے کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خالی معدہ میں تیزابیت بھی کم ہوتی ہے اور ایک حفاظتی مادے MUCIN کی تہہ معدہ

کے اندر کی سطح پر جمع ہو جاتی ہے اس سے زخم تیزی سے اچھا ہوتا ہے۔ مزید براں معدہ میں السر پیدا کرنے والے جراثیم بھی خالی معدہ میں نشو ونما نہیں پاتے۔

(ر) بڑی آنت کی زود حسی (IRRITABLE BOWEL)

یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جس میں مریض کو آنتوں کی کسی بیماری کے بغیر بار بار بیت الخلا جانا پڑتا ہے۔ روزہ رکھنے سے اس مرض پر اچھا اثر اس طرح پڑتا ہے کہ بڑی آنت ایک طویل وقفے کیلئے خالی ہو جاتی ہے اور اس لیے حاجت محسوس نہیں ہوتی۔

☆دل کے امراض میں فائدہ

روزہ رکھنے سے خون میں کولیسٹرول اور دوسرے LIPIDS یعنی شحمیات کی مقدار میں کمی آجاتی ہے، اور اس طرح دل کو خون مہیا کرنے والی رگوں میں جمنے والی کولیسٹرول بھی کم ہو جاتی ہے، اور اس سے دل کی بیماری سے بچنے میں مدد ملتی ہے۔ یہی حال دماغ کو خون مہیا کرنے والی رگوں کا بھی ہے۔ کولیسٹرول کی کمی ان کی بھی حفاظت کرتی ہے اور اس سے فالج کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

☆ذیابیطس

روزہ رکھنے سے موٹاپے کی کمی اور خون میں شوگر کی کمی کی وجہ سے لبلبہ سے انسولین کی مہیا کی گئی مقدار میں کمی سے ذیابیطس پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے ایک انتہائی اہم مشاہدہ یہ ہے کہ روزہ رکھنے والے وہ مریض جو نا صرف رمضان کے روزے رکھتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی اکثر نفلی روزے رکھنے کے عادی ہیں ذیابیطس کی وجہ سے جسم کے مختلف اعضاء پر پڑنے والے برے اثرات (COMPLICATION) سے بہت طویل عرصہ تک بچے رہتے ہیں۔ یہاں یہ بات بتانا بھی ضروری ہے کہ ذیابیطس کے ایسے مریض جو علاج کیلئے انسولین کے ٹیکوں پر انحصار کرتے ہوں ان کیلئے روزہ رکھنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان کو شریعت کی رُو سے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے لیکن ان کو روزہ کا فدیہ ادا کرنا ہوگا۔

☆قوت مدافعت میں اضافہ

کئی مریضوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ کئی پرانی بیماریاں جو عام علاج سے ٹھیک نا ہوں روزے رکھنے سے ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ بلکہ رمضان کے علاوہ اگر حدیث کے مطابق صرف پیر اور جمعرات کے روزے مسلسل رکھے جائیں تو مریض شفایاب ہو جاتا ہے، اور بیماریوں سے شفایاب ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ روزہ رکھنے سے انسان کی قوت مدافعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

محشر خیال

کرامت بخاری، لاہور

آپ کا گراں قدر پرچہ ''بتول'' نظر نواز ہوتا رہتا ہے۔آپ کے ہاں توازن، اعتدال اور غیر جانبدارانہ عنصر اس پرچے کی مقبولیت اور اہمیت میں اضافہ کر رہا ہے ورنہ نسائی تحریکوں نے عجب رویہ اختیار کر لیا ہے اور NGO's نے اور زیادہ زور پکڑ لیا ہے، اعتدال کی راہ مفقود ہوتی جارہی ہے۔ہم نے اپنی تہذیب، ثقافت، اپنی اسلامی اقدار اور اپنی برگزیدہ ہستیوں کے نقش قدم پر چلنا، اسلام نے جتنی عزت، احترام، وقار، حقوق اور اہمیت خواتین کو دی ہے کسی اور معاشرہ نے ایسا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے پرچے کو مزید انعامات سے نوازے۔

ایک سادہ سی غزل حاضر ہے۔

سید یاسر قاسمی۔لاہور

آپ کا مؤقر ماہنامہ باقاعدگی سے نظر نواز ہوتا رہتا ہے۔اداریہ سے لے کر آخری صفحے تک قارئین کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔خواتین کے علاوہ اس میں مرد حضرات کی دلچسپی کا بھی وافر سامان موجود ہے۔اللہ پاک آپ سب کی ان کوششوں کو ہمیشہ بارآور کرتا رہے آمین۔

میری والدہ (نجمہ یاسمین یوسف صاحبہ) تقریباً ساٹھ ستر کی دہائی سے اس رسالے کی قاری ہیں بلکہ اب تو کئی سالوں سے اس کی لکھاری بھی ہیں۔میرے بڑے بھائی سید حیدر قاسمی کے دوست اویس قریشی جو پروفیسر محمد طفیل کے بیٹے ہیں، غالباً یہ رسالہ ۱۹۷۰ کے شروع میں ہاتھ سے لکھ کر لایا کرتے تھے۔اپنی والدہ کا انٹرویو ''بتول'' میں شامل دیکھ کر خوشی ہوئی۔البتہ متن میں کچھ اغلاط ہیں جن کی تصحیح ضروری ہے۔

شمس العلما سید مولوی ممتاز میرے دادا کے رشتے میں ماموں ہوتے تھے۔اٹھارہ سو عیسوی میں انہوں نے دارالاشاعت پنجاب کی داغ بیل ڈالی۔مولوی ممتاز نے میری والدہ کا مضمون شائع ہونے پر ان کو شاباش دی، یہ درست نہیں ہوسکتا۔کتابت کی غلطی مفہوم کو کیا سے کیا کر دیتی ہے!ہاں البتہ ان کے

صاحبزادے سید امتیاز علی تاج اور ان کی اہلیہ حجاب امتیاز علی ضرور آئے تھے، انہوں نے نہ صرف شاباش دی بلکہ وعدہ لیا کہ وہ لکھنے میں کبھی تساہل نہیں برتیں گی۔ یہ دونوں شخصیات اردو ادب کی آبرو ہیں۔

ہے شکستِ آئینہ ہی مری بندگی کا حاصل
مرے دل کو بھا گیا ہے روئے بے نشان ہونا

اس شعر میں بندگی کی بجائے زندگی درج ہو گیا ہے جس سے شعر کی گہرائی و گیرائی میں فرق پڑ گیا ہے۔ صفحہ ۶۲ پر ''یہی وہ معتبر شہر ہے جہاں حضرت نظام الدین اولیا پیدا ہوئے'' میں معتبر کی بجائے حقیر لکھا گیا ہے۔ صفحہ ۶۵ کالم ایک ''کل تین کتابیں'' نہیں بلکہ ۳۶ کتابیں درست ہے اور کالم دو ''مشکل اس لیے پیش آئی'' کے بجائے ''مشکل اس لیے پیش نہیں آئی'' پڑھا جائے۔

والدہ ایک نشست کا بڑی محبت سے ذکر کرتی ہیں جس میں محترمہ ثریا اسما اور ڈاکٹر شگفتہ نقوی کے ساتھ کچھ خوشگوار وقت گزرا اور آپ سب کے ساتھ ان دونوں کی ملاقات اور محبتوں کے لیے بہت شکر گزار رہتی ہیں۔

☆ ہمیں بھی ان سے تعلق اور ان کی محبت بہت عزیز ہے۔ اغلاط کے لیے معذرت قبول کیجیے۔ (مدیرہ)

خورشید بیگم۔ گوجرہ

الحمدللہ خوش بختی کہ بتول 4 جون کو مل گیا۔ تبصرہ لکھنے کے لئے وقت مل گیا۔ اداریہ میں کیا خوب تعریف کی صائمہ اسما صاحبہ نے دورِ حاضر کے میڈیا کی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہی میرے دل میں بھی تھا۔

بلاشبہ تزکیہ کرنے والے پیارے نبیؐ نے تاریخ انسانی کا عظیم انقلاب برپا کیا۔ ان کی نافع تعلیمات اب بھی موجود ہیں لیکن اچھا نتیجہ تو عمل کا محتاج ہوتا ہے۔ خاص مضمون ''ہم کیا پی رہے ہیں'' ڈاکٹر ام کلثوم صاحبہ نے مضرِ صحت مشروبات سے آگاہ کیا ہے، بے حد مفید تحریر ہے۔ ''قطرہ قطرہ شبنم'' ڈاکٹر شگفتہ نقوی صاحبہ کتنے اچھے انداز سے معاشرہ کے مجبور طبقہ کی طرف ہماری توجہ مبذول کروا رہی ہیں۔

''اولڈ ایج ہوم'' میرزا ادیب کی کہانی خوبصورت انتخاب ہے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اولاد بوڑھے والدین کو اولڈ ایج ہوم میں داخل کروا دیتی ہے اور کبھی

والدین گھر کے شور وغوغا سے گھبرا کر اولڈ ایج ہوم کا رخ کر لیتے ہیں۔ اولاد کو والدین کا اتنا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اپنی بسائی ہوئی جنت کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کا ارادہ بھی نہ کریں۔ ''شکست کے رتھ پر سوار'' محترمہ نصرت یوسف صاحبہ کا ناولٹ بخیریت تمام ہوا۔ کاش مصنوعی روشنیوں اور عارضی خوشیوں کے پیچھے بھاگنے والے عبرت حاصل کریں۔

بہن قانتہ رابعہ نے اپنی والدہ محترمہ کی زندگی کی جھلکیاں دکھا کر ماں کی یاد تازہ کر دی۔ ان کی والدہ تو مجھے دورِ حاضر کی ولیہ لگتی ہیں۔ ماں کا پیار نہیں پایا لیکن اوروں کو ماں کا پیار دیا، ہے نا منفرد خوبی! خدائے رحمٰن کا احسان کہ ان کا ایک جگر پارہ اہلِ گوجرہ کے حصہ میں بھی آیا جو تاحیات اپنی والدہ کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔

''رب کی سرگوشی'' ڈاکٹر بشریٰ تسنیم صاحبہ آپ کے خیالات کی بلندی کی کم از کم میں تو قائل ہوگئی ہوں۔ اللہ کرے اپنے رب کی سرگوشی ہمارے دل کے کان بھی سن لیں (آمین)

☆☆☆

بتول میگزین

عظمٰی نے کہانی سنائی

(فریدہ خالد۔کراچی)

ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ہم تین ساتھی اپنے قریبی ہسپتال کے بچوں کے وارڈ میں مہینے میں دو دفعہ وزٹ کرنے جاتے ہیں۔ہمارے اس وزٹ کا مقصد بیمار بچوں اور انکی ماؤں کو قرآن وسنت کی تعلیم کے ذریعے خدمتِ خلق کرنا ہے۔ہم تینوں ساتھی بچوں اور ان کی ماؤں کے لئے مختلف اقسام کی ایکٹیوٹیز کرتے ہیں مثلاً کلرنگ کروانا، کہانی سنانا، اذکار یاد کروانا، ہسپتال میں طہارت کے اہتمام کے طریقے بتانا اور پہلا کلمہ اور دعائیں یاد کروانا وغیرہ شامل ہیں۔بیمار بچے اور انکی مائیں یہ سب بہت خوشی سے کرتے ہیں۔بلکہ کچھ پرانے مریض ہمارا انتظار کرتے رہتے ہیں!

ہماری ساتھی صوفیہ کے لئے کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کام کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا لہذا صائمہ اور میں نے کچھ اور لوگوں کو شامل کرنے کی کوشش شروع کر دی تاکہ صوفیہ کے جانے سے پہلے ہی ہمارا نیا ساتھی کام کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔اس سلسلے میں کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ ہسپتال کا وزٹ کیا اور بالآخر عظمٰی نے کام کی حامی بھر لی۔ مجھے ذاتی طور پر عظمٰی کی شمولیت پر بڑی خوشی تھی کیونکہ وہ میری پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ دار اور اچھی انسان ہے۔

اب ہم نے عظمٰی کی ٹریننگ شروع کی، تاکہ اگر ہم میں سے کوئی ساتھی کسی دن نہ آسکے تو بھی ہماری پلان شدہ ایکٹیوٹی کروانے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔جب عظمٰی کو کہانی سنانے کا کہا گیا تو وہ گھبرا گئی کہ اس کے لئے یہ بہت مشکل کام ہے کیونکہ اس کو کہانی سنانا نہیں آتا۔ ہمارے اصرار اور تعاون کا یقین دلانے پر اس نے حامی بھر لی مگر مجھے فون پر کہتی رہی کہ یہ بہت مشکل کام ہے میں نے کبھی نہیں کیا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے کہانی سنانے کی تیاری شروع کر دی۔ مقرر تاریخ سے کوئی پانچ یا چھ دن پہلے اس نے مجھے اپنی کاپی پر لکھی کہانی دکھائی جو کہ حضرت آدمؑ کے بارے میں تھی۔دراصل ہم ہمیشہ قرآن میں دیئے گئے کسی واقعے کو بچوں کی سمجھ کے مطابق کہانی میں ڈھالتے ہیں اور اس سے کوئی نہ کوئی سبق نکال کر ڈسکس کرتے ہیں تاکہ بچے اور مائیں اس کہانی میں دیئے گئے سبق پر عمل کرنے کے قابل ہو سکیں۔

جی تو میں کہہ رہی تھی کہ عظمٰی نے بڑی محنت سے کہانی لکھی، مجھ سے ڈسکس کی اور پھر بچوں کو سنائی۔ واپسی پر حسبِ معمول ہم نے اسے فیڈ بیک دیا جو کہ اس نے ہنستے ہوئے قبول کیا اور اگلی دفعہ کہانی سنانے کی ذمہ داری بھی لی۔دوسرے وزٹ سے پہلے عظمٰی نے پھر اپنی بھرپور تیاری شروع کر دی، ہم سے ڈسکس کیا اور اس دفعہ کی کہانی میں اس نے حضرت ابراہیمؑ کا ایک اللہ پر ایمان، بتوں اور شرک کی نفی اور اللہ پر توکل کو بڑے خوبصورت انداز میں فوکس کیا۔حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالے جانے والے واقعے کو سناتے ہوئے ان کی مانگی گئی دعا کو بھی بچوں اور ماؤں کو یاد کروایا۔غرض اس دن کہانی سنانے کی ایکٹیوٹی بہت بہتر ہوئی۔

واپسی پر وہ خود کو فیڈ بیک دیتے ہوئے خوشی سے بولی'' آج تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ان بچوں سے باتیں کر رہی ہوں اور آج دل میں بہت خوشی کا احساس ہے کہ میں نے اپنے علم سے بہت تھوڑا ہی سہی مگر دوسروں سے شیئر کیا ہے''۔

اس کی بات سنتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو کتنی صلاحیتیں دی ہیں جن کا اکثر ہمیں اندازہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب ہم انہیں دوسروں سے کھلے دل سے شیئر کرتے ہیں۔لہٰذا ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہر وقت لینے کی فکر کے بجائے دوسروں کو دینے والے بنیں اور شاید اس طرح اللہ کے پسندیدہ لوگوں میں شامل ہو جائیں۔

☆☆☆

نصیحت

(شہزادی ام صائم)

یہ تقریباً آٹھ یا نو سال پہلے کی بات ہے لیکن جب یاد آتی ہے تو بیٹے کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ کس طرح اس کی ایک بات سے میں گمراہی کی طرف جاتے جاتے واپس آ گئی۔

میں لوگوں کے کپڑے سلائی کیا کرتی تھی جو عورتیں مجھ سے کپڑے سلوانے آتیں تو اکثر کہتیں کہ جیسا سٹار پلس کے فلاں ڈرامے میں فلاں نے لباس پہنا تھا ویسا ڈیزائن بنا دیں۔

اور جب میں اُن سے کہتی کہ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ سٹار پلس ہے کیا تو وہ بہت حیران ہوتیں۔ ظاہر ہے میں نے سلائی کرنی ہوتی تھی، گھر کے سارے کاموں کے ساتھ نماز، قرآن بھی تو ایسے میں ٹیلی ویژن دیکھنے کا ٹائم کہاں سے ملے گا۔ وہ عورتیں مجھے رات کا وقت بھی بتاتیں اور دن میں جب وہ ڈرامے لگتے وہ بھی۔ میں نے سوچا کہ اچھا دیکھوں کہ آخر ان ڈراموں میں اور ان کے لباس میں ایسا کیا ہے جو ہر کوئی مرا جا رہا ہے۔ اگر بازار کا چکر لگتا تو ہر کپڑا کسی نہ کسی سٹار پلس کے کرداروں کے نام پر ہی بکتا۔

بہر حال ایک دن میں نے بھی سٹار پلس لگا ہی لیا پھر ہوا یہ کہ شیطان نے اُسے مزین کر کے مجھے دکھانا شروع کیا۔ اب کپڑے سینا تو میری مجبوری تھے لیکن گھر کے کاموں میں سستی ہونا شروع ہو گئی اور سب سے بڑھ کر نماز اور قرآن میں۔ ایک تو دیر سویر بھی ہو جاتی اور دوسرا جلدی جلدی پڑھتی کہ ڈرامہ نہ نکل جائے۔

ایک نئی ٹینشن سر پر مسلط کر لی، کوئی قسط رہ جاتی تو پریشانی اور پھر آگے کیا ہو گا وہ پریشانی الگ۔

میرا چھوٹا بیٹا اُن دنوں دوسری کلاس میں تھا۔ اُسے سکول سے لینے جاتی تو ٹی وی لگا ہی چھوڑ کے جاتی کہ آ کر لگانا نہ پڑے۔ اب بچے کو لا کر ٹی وی کے سامنے بٹھا دیا اور وہیں پر اس کے کپڑے بدل رہی ہوں، کھانا کھلا رہی ہوں۔ ایک عجیب سی افراتفری زندگی میں شامل ہو چکی تھی۔

رات کو جب سب اکٹھے بیٹھتے تب بھی میں سٹار پلس ہی دیکھتی تو میرے ساتھ بچوں کو بھی عادت ہونے لگی اور تو اور میں نے مشین بھی برآمدے میں ایسی جگہ رکھی کہ باہر بیٹھ کر بھی ڈرامہ دیکھتی رہوں۔

تقریباً ایک، ڈیڑھ سال اسی افراتفری اور بے چینی میں گزرا اور پھر اللہ کو میری ہدایت منظور ہوئی۔ اتوار کے دن میں ٹی وی لگا کے بیٹھی ہوئی تھی تو میرا بڑا بیٹا جو ان دنوں وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اس نے مجھ سے ایسی بات کہی کہ واقعی میری تو روح کانپ گئی۔

اس نے کہا ہم تو صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ ان ڈراموں نے تو مسلمانوں کے گھروں سے جہاں پر اللہ کا ذکر بلند ہونا چاہیے، جہاں سے قرآن کی تلاوت کی آواز آنی چاہیے، وہاں چوبیس گھنٹے ہر گھر سے مندروں کی گھنٹیاں، بھجن اور بتوں کی پوجا کی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں۔ ویسے ہم انھیں کافر، دشمن اور پتہ نہیں کیا کیا کہتے ہیں لیکن ان کی ہر چیز سے اتنی محبت ہے کہ ان کے بغیر جینا مشکل ہے اور پھر روتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل نہیں ہو رہی۔

اس کی بات ایسی میرے دل کو جا کر لگی کہ میں نے اٹھ کر ٹی وی بند کیا، اللہ سے معافی مانگی، ڈراموں سے توبہ کی اور شکر کیا کہ میرے گھر سے یہ سلسلہ ختم ہوا اور دوبارہ سے میری زندگی میں سکون آنا شروع ہوا۔

پھر میں جہاں بھی جاتی سٹار پلس لگا ہوتا تو اپنے بیٹے کی کہی ہوئی بات ضرور پہنچا دیتی اور واقعی اس بات سے میرے بہت سے ملنے والوں نے یہ ڈرامے دیکھنا چھوڑ دیے۔

یہ بھی سچ ہے کہ شیطان آپ کو چیزیں مزین کر کے دکھاتا ہے لیکن ہاتھ پکڑ کر چلنے پر مجبور نہیں کرتا۔ اگر ہم تھوڑا سا خبردار رہیں تو شیطان کے وسوسوں سے بچا جا سکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہمیشہ 'وتواصوبالحق' ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔ پتہ نہیں کون سی بات کسی کے دل پر اثر کر جائے اور وہ گمراہی کی طرف بڑھتا بڑھتا ہدایت کی طرف پلٹ آئے!

☆☆☆

رمضان کا مسلمان

(حفصہ افضال)

دنیا کے دروازے کا کنڈا ہلا۔

مسلمان نے افق کے غازہ پہ نگاہ دوڑائی۔

کمان کی شبیہہ چراتا ہلال جگمگاتا دکھائی دیا۔

مسلمان نے دروازہ کھول دیا، مہمان کے اندر ہی چار سو اللہ کی رحمت کی چادر تن گئی۔

مسجدوں کے جالے صاف کیے جانے لگے۔ اللہ کے گھر دم دم بڑھتے ویرانیوں کے سائے نمازیوں کے نقشِ پا سے مٹتے چلے گئے۔

طاقوں میں سے سجے قرآن باہر نکالے جانے لگے۔

دھول مٹی سے دھندلائے قرآن کے حرف واضح ہوگئے۔

تفسیر کی کتب جھاڑی جانے لگیں۔ رب کا پسندیدہ وقت، رات کا پچھلا پہر آباد ہوگیا۔ مسلمان اپنے نفس کو کچل کر اوقات سحر میں بیدار ہونے لگا۔

راتیں ذکر الٰہی سے منور ہونے لگیں۔ گلی کوچے رب تعالیٰ کی حمد وثناء سے مہکنے لگے۔ صبر کی کونپل پھوٹ نکلی اور مسلمان اسے ضبط کا پانی دینے لگا۔ اللہ کے مہمان کے ساتھ ہی مسلمانیت بھی لوٹ آئی۔

اللہ تعالیٰ کے ذکر کی محفلیں پر رونق ہوگئیں۔

ریڈیو پہ، ہر دم اونچے سروں سے بجتے ریکارڈ کی جگہ حمد باری تعالیٰ نے لے لی۔ مہمان کے ہمراہ آئے تحائف اور انکی قدر و قیمت پہ وعظ ہونے لگے۔ علماء حضرات مہمان کی تواضع کے طریقے سمجھانے لگے۔

نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر...... ہر شے صبغۃ اللہ میں رنگ گئی۔ مسلمان نے اپنی وضع بدل ڈالی...... میرج ہالوں میں قرآن سنایا جانے لگا۔

معاشرہ رحمت کی برکھا سے دھل کر نکھر آیا۔

ظلم وزیادتی کے نتیجے میں بڑھتی کثافت جاتی رہی۔ بالکل ایسے جیسے برسوں سے پیاسی زمین، پانی ملنے کے بعد تر و تازہ ہو جائے۔

بھائی چارے کا ایسا نظام تشکیل پایا کہ امیر، غریب...... دو وقت کھانے لگے۔ حاجت مند مانگتے رہے...... جھولی پھیلاتے رہے اور حاجت روا لٹاتا گیا...... لٹاتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ پھر زمین کے دروازے کا کنڈا ہلا......

مسلمان نے افق کے غازہ پہ نگاہ دوڑائی۔ کمان کی شبیہہ چراتا ہلال عید جگمگاتا دکھائی دیا۔ مسلمان نے خوشی خوشی دروازہ کھول دیا۔ ''عید الفطر'' اندر داخل ہوئی۔ رمضان اس سے بغل گیر ہوا اور کھلے دروازے سے رخصت ہوگیا۔

مسلمان نے عید کا والہانہ استقبال کیا۔ خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ ٹی وی چینلز ''میٹھا زہر'' انڈیلنے لگے۔ مسلمان نے قرآن چوم کر طاق میں سجایا اور تفاسیر کی کتب کو سب سے اونچے والے شیلف پہ ''سنبھال'' کر رکھ دیا۔ پچھلا پہر ویران ہوگیا۔ مسجدوں میں پھر مکڑیوں کا بسیرا ہوا۔ مسلمان مہینہ بھر کی ''تھکاوٹ'' اتارنے لگا۔ نوافل تو دور کی بات فرائض سے بھی روٹھ کر......

حمد و ثناء کی جگہ گلی کوچے شیطانی آوازوں سے گونجنے لگی۔ مسجدیں ویران اور بازار آباد ہوئے۔ دل پھر سے زنگ آلود ہونے لگے۔ معاشرہ دغابازی، جھوٹ، فریب اور ظلم وزیادتی کی دھول سے اٹ گیا۔ ''آدمیت'' دم دبا کر بھاگ گئی۔ امیر کے گھر تینوں وقت چولہا جلنے لگا اور غریب کی آنکھوں میں محرومی کے سائے بڑھنے لگے۔ میرج ہالوں میں ایک دفعہ پھر قرآن کے سائے میں قرآن کے منافی کام ہونے لگے۔

تاروں بھرے آسمان نے دیکھا، رمضان کے ساتھ ہی مسلمانیت بھی رخصت ہوگئی......!!!

☆☆☆

دنیا بدل دو......تبدیلی کا اصل گُر

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

دنیا ظلم سے اسی لیے بھرتی جارہی ہے کہ بظاہر مظلوم کا ساتھ دینے والے بھی کسی نہ کسی شکل میں ظالم ہی ہوتے ہیں

ہر انسان انفرادی طور پر دو محاذوں پر نبرد آزما ہے۔اندر اور باہر کی کشمکش روحانی وجود اور حیوانی وجود کی طلب کے تضادات، سچ اور جھوٹ کے درمیان چکراتا انسان۔رحمٰن اور شیطان کے بلاوے کلیسا و کعبہ کے دروازوں پہ دستک دینے کو بڑھتے اور رکتے ہاتھ۔ ضمیر کی عدالت میں نفس کی پیشیاں بھگتا تا انسان...... اُف! کس قدر بے بسی ہے اور کتنی کشمکش ہے اس ظاہر و باطن کو مطمئن کرنے میں......!

ہر گھر میں دو محاذ ہیں ایک شوہر کا ایک بیوی کا۔ شوہر خواہشات نفس کے ہاتھوں مجبور ہے باہر کی رنگینیاں اور بیوی کی سنگینیاں۔بیوی میں کوئی خوبی ہے یا نہیں؟ بیوی میں وہ رنگینی کیوں نہیں جو دوسرے کی بیوی میں نظر آتی ہے، پتہ نہیں بیوی اچھی ہے یا محبوبہ؟ اور شوہر محبوبہ کی تلاش میں بیوی کی محبت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔جانے کیا اچھا تھا؟ اور کیا برا ہو گیا ہے؟ شوہر انہی دو تلکۂ محاذ میں ڈول رہا ہے۔

بیوی کے اپنے خدشات ہیں۔میں بیوی ہوں یا محبوبہ؟ کیا بیوی محبوبہ نہیں ہو سکتی؟ اور جو کبھی محبوبہ تھی بیوی بن جانے کے بعد محبوبہ کیوں نہیں رہی؟ عجیب کشمکش ہے۔محبوبہ بیوی بن جانے کے بعد محبت کو ترستی ہے اور بیوی محبوبہ بن جانے کی تگ و دو میں نہ بیوی رہتی ہے نہ محبوبہ۔

میاں بیوی کا یہ محاذ حسرتوں کے تیر و تفنگ نے میدان کارزار بنا رکھا ہے۔

خاندان دو طرح کی جنگوں میں پھنسا ہوتا ہے۔ حقوق و فرائض کی جنگ۔ہر فرد حق لینے کا دعوے دار ہے۔فرض سے غافل ہے۔جب معاشرے میں لینے کا چلن عام ہو جائے اور دینے کو ہاتھ نہ کھلے تو بے برکتی و بے سکونی کا غبار ہر رشتہ کی اصل کو دھندلا دیتا ہے۔

ہر ملک میں عوام اور حکومت صف آراء ہیں۔عوام ذہنی، جسمانی، نفسیاتی، معاشی اور جذباتی طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ظالم کی حمایت کریں یا مظلوم کا ساتھ دیں؟ ظالم کی شناخت کون کرے؟ شناخت ہو جائے تو اس کا ہاتھ پکڑنے کی پہل کون

کرے؟ مظلوم کی دادرسی کے بعد اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں گی ان پہ استقامت کہاں سے آئے؟ استقامت کا یہ فقدان ظالم کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

دنیا دو محاذوں پر صف آراء ہے۔ حق اور باطل۔ حق کا ساتھ دینے والے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ باطل کا ساتھ دینے والے ہر موڑ پر مل جاتے ہیں۔ ہر انسان اپنے باطن کے دجال کو پہچاننے سے قاصر ہے۔ ہر قوم کا ایک دجال ہے اور ایک وہ دجّالی میڈیا کا فتنہ ہے جو پوری دنیا پر مسلط ہے۔ دجال آخری دور کا فتنوں میں سے بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے بچنے کی فکر کا انداز، طریقہ اور منصوبہ ہی یہ باور کراتا ہے کہ اس سے جیت جانے کے کتنے امکامات ہیں، یقیناً جنگ جیتنے کے لئے مدمقابل کی قوت کا اندازہ کر کے اپنی طاقت میں اضافہ کرنا لازمی ہوتا ہے۔ وہ قوت اسلحہ کی ہو، افرادی طاقت ہو، یا پھر اپنے ارادے اور ایمان کی پختگی استقامت، جنگ اپنے نفس کے ساتھ ہو یا پھر شیطانی قوتوں کے ساتھ ارادے کی پختگی۔ عزم و یقین کی دولت ہی بنیادی طور پر کسی بھی انسان اور قوم کو کامیابی کی امید دلاتی ہے۔ افرادی قوت کس کام کی اگر دلوں میں اضمحلال ہو۔ ارادے متزلزل ہوں۔ منزل سامنے نظر ہی نہ آرہی ہو؟ کوئی بھی جسمانی طور پر قوی ہیکل فرد محض اپنی جسمانی طاقت کے بل پر منزل کو نہیں پا سکتا۔ نہ کوئی قوم اسلحہ کے زور پر کسی قوم پہ فتح پا سکتی ہے۔ حق پہ ڈٹ جانا ہی دراصل جیت جانا ہے۔ نفس کے خلاف، ظالم کے خلاف، باطل کے خلاف۔

اگر کوئی ظالم یا باطل کے خلاف ڈٹ کے کھڑا ہو جائے مگر اپنے نفس سے زیر ہو جائے تو وہ ناکام ہی ہے۔ کسی نہ کسی مقام پر آ کر وہ ظالم کا ساتھ ہی دے رہا ہوگا بلکہ وہ خود ظالم ہی ہوگا۔ جو اپنے نفس کے ساتھ خیر خواہ نہیں ہے وہ کہاں دوسروں کی خیر خواہی میں کامل ہوگا!! دنیا ظلم سے اسی لیے بھرتی جاری ہے کہ بظاہر مظلوم کا ساتھ دینے والے بھی کسی نہ کسی شکل میں ظالم ہی ہوتے ہیں۔

زندگی کا فلسفہ یہی سمجھاتا ہے کہ اگر دنیا سدھارنی ہے تو ساری قومیں انسانیت کی راہ اختیار کر لیں۔ قوموں نے اصلاح پانی ہے تو خاندان اپنے گھروں کو سکون کا گہوارہ بنا لیں۔ گھروں اور خاندانوں کو محبت و آشتی کا گہوارہ بنانا ہے تو میاں بیوی اپنے اپنے حقوق و فرائض کی فہرست پہ اصلاح کی نیت سے نگاہ ڈال لیں

اگر مثالی جوڑے بننا ہیں تو ہر شوہر اور بیوی اپنے اپنے نفس کا جائزہ لے۔ اور اپنے ضمیر کی عدالت میں بری ہونے کے لئے اپنی اولادوں کو اگلی نسل کو بہترین انسان بنانے کا عزم کرلیں۔

آج کا ہر فرد خود کو ایک معیاری انسان ، اللہ کی نظر میں قابل قبول مسلمان بنالے تو دنیا سنور جائے گی۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس فساد سے بھری دنیا میں اپنے حصے کا کام کر کے جائیں۔ ہم سوچ لیں کہ ہم نے اگر اپنے آپ کو بدل لیا تو دنیا کو بدل دیا۔ دنیا کو بدل دینا کوئی اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے۔ ارادے کی پختگی چاہیے۔ آخر ہم اور آپ کیا کچھ نہیں بدلتے ؟ لباس، زیور، کاروبار، مکان، شہر، ملک بدل لیتے ہیں کہ ہماری حالت بہتر ہوجائے، حالات بدل جائیں پہلے سے اچھے ہوجائیں۔

ہم سب کچھ بدلنے پر راضی ہوجاتے ہیں مگر خود کو نہیں بدلتے۔ ہر چیز کو بہتر سے بہترین کرنے اور اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اپنے نفس کی اصلاح نہیں کرتے۔

☆☆☆

خدارا ہمیں مسلمان ہی رہنے دو

میرے پیارے نبی ﷺ کو تو پوری کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔قرآن اور سنت رسول ﷺ کے مطابق کسی مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا تاوقت کہ وہ اپنے، اپنے اہل وعیال، اپنے والدین، اپنے مال حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی زیادہ محمد ﷺ سے محبت نہ کرے۔ نبی ﷺ تو ہمارے لیے اتحاد، یگانگت اور بھائی چارے کا نمونہ ہیں مگر ہم کیسے مسلمان ہیں کہ ہم اپنے نبی ﷺ سے محبت کے اظہار پر بھی ایک دوسرے سے لڑ پڑے۔ 12 ربیع الاول کے روز ملنے والے موبائل پیغامات سے مجھے احساس ہوا جیسا کہ ہر پیغام بھیجنے والا کوئی عالم فاضل مفتی ہو۔ زیادہ تر پیغامات اگر چہ عید میلا د النبی ﷺ مبارک کے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بحث جاری تھی کہ ہمیں 12 ربیع الاول منانا بھی چاہیے کہ نہیں؟ اس موقع پر بازاروں میں یا ہمسایوں میں تقسیم کیے جانے والے کھانے کے متعلق بھی فتوے صادر کیے جا رہے تھے۔ بات یہ بھی کی جارہی تھی کہ آیا 12 ربیع الاول نبی ﷺ کی پیدائش کا دن ہے بھی یا نہیں۔ کیا عیدیں دو ہیں یا تین؟ کسی نے اس عمل کو بدعت جانا تو کسی نے اپنے ایمان کا حصہ۔ جس بحث کو ایک محدود حلقہ میں ہونا چاہیے اسے ہم نے موبائل پیغامات کے ذریعے گھر گھر تک پھیلا دیا۔ فتوے پر فتوے دیئے جا رہے ہیں۔ ایک قرآن، ایک نبی ﷺ کو ماننے والے ایک دوسرے کے خلاف نبی ﷺ سے محبت کے اظہار کے طریقہ کار پر ایک دوسرے کے خلاف اس انداز میں نفرت پھیلا رہے ہیں کہ اگر اس کو روکا نہ گیا تو معاملات بہت خراب ہو جائیں گے۔ افسوس کہ حکومت تماشا دیکھ رہی ہے جب کہ ایک بہت بڑی تعداد میں علماء اس تقسیم در تقسیم کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ ان دنوں طارق اسمٰعیل ساگر کی تازہ تصنیف ''مجھے کھا گئے'' پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔ لاہور کے متعلق اپنے بچپن کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں''لاہور کے داخلی دروازے یعنی پہلی جوگی کے ساتھ موجود پھولوں، پھلوں، جنگلات اور دریا والی اس مضافاتی بستی راوی

روڈ کی تباہی کا آغاز 1965ء میں ہوا جب ایک روز ہمیں علم ہوا کہ یہاں ٹمبر مارکیٹ بنے گی۔ اچانک ہی ہمارے گھر کی دیوار سے لگے پھولوں کے سالوں پرانے پودے کٹنے لگے۔ٹریکٹر چلنے لگے...... ہمارے نزدیک مسجد شاید صرف بادشاہی مسجد ہی تھی۔جس میں ہم سب عید کے روز اکٹھے ہوکر نماز پڑھنے جاتے یا پھر ٹمبر مارکیٹ میں وہ پر امن مسجد جہاں ہم نماز پڑھا کرتے تھے۔ دھاکہ پروگرام کا آغاز علامہ...... صاحب نے کیا اور ہمیں علم ہوا کہ ہم تو سنی ہیں جبکہ ہم آج تک خود کو مسلمان ہی سمجھتے رہے۔ جب ہمارے پچھواڑے میں ملک......مرحوم نے مسجد بنائی تو علم میں اضافہ ہوا کہ ہم حنفی، دیوبندی ہیں۔اس طرح مزید مسجد یں بنیں مزید فرقے بھی سمجھ میں آئے اور یہ بھی علم ہوا کہ اصل میں اہلسنت والجماعت مولوی...... کی مسجد میں نماز پڑھنے والے ہی ہیں باقی سب گمراہ اور منافق ہیں کیونکہ وہ ''یارسولؐ نہیں کہتے''میں ذاتی طور پر ساگر صاحب کو نہیں جانتا مگر یہ سچ ہے کہ علماء اور مولانا حضرات کی ایک بڑی تعداد نے ہم سے ہماری مسلمانیت کو چھین کر ہمیں فرقوں میں تقسیم در تقسیم کر دیا ہے اس کام میں وہ اب بھی لگے ہوئے ہیں مگر انہیں کوئی روکنے والا نہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے تو فرقہ بندی سے سخت ممانعت کی ہے مگر ہماری پہچان ہی فرقوں کو بنا دیا گیا۔ یہ کیسی مسلمانیت ہے؟؟ یہ نبیﷺ سے کیسی محبت ہے؟ ہماری حالت کا اگر آپ کو اندازہ لگانا ہو تو میرا ایک ذاتی تجربہ سنئیے۔گزشتہ سال جب سابق امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد کا انتقال ہوا تو اپنے علاقہ کی ایک مسجد کے مفتی صاحب کو میں نے درخواست کی کہ قاضی صاحب ایک مجاہد اسلام اور اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے ان کے لئے دعا کی جائے۔ میں خصوصی طور پر اسی مسجد اور انہی مفتی صاحب کے پیچھے تقریباً دو دن باجماعت نماز ادا کرتا رہا مگر انہوں نے ایک مرتبہ بھی قاضی صاحب کے لیے دعا نہیں کرائی۔ ہمارا دین تو ایک عام کلمہ گو کے مرنے پر اس کی مغفرت اور مشرکوں کے لئے ہدایت تک کے لیے دعا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ قاضی صاحب کے لئے دعا کرنے والوں کی تو ویسے کمی نہ تھی مگر مجھے اس بات کا افسوس ہوا کہ ایک مفتی جس نے قرآن کو پڑھا، جو اپنی تقریروں میں نبیﷺ کی سنت پر عمل کرنے کی تعلیم دیتا ہے اسے کس چیز نے اتنا سنگدل بنا دیا۔ میں مختلف مساجد میں نماز کے لئے جاتا ہوں۔میں نے اگر

مسلمانوں کوفرقوں میں بانٹنے والے مولویوں، مفتیوں وغیرہ کو دیکھاتو میں نے ایسے علمائے کرام اورمفتی حضرات کوبھی دیکھا جوفرقہ واریت کی آگ کو بجھاتے اور برداشت کا سبق پڑھاتے ہیں۔گزشتہ جمعہ کی نماز میں نے جس مسجد میں ادا کی اس کے مفتی صاحب کو میں نے ایسے ہی علماء میں پایا جومسلمانیت کی بات کرتے ہیں ،جوتفرقہ بازی سے منع کرتے ہیں، جو ہمیں ایک دوسرے کے خلاف فروعی اختلافات کی بنیاد پرفتویٰ بازی سے روکتے ہیں۔ کاش ہمارے علمائے کرام اور ہماری حکومت ہرگلی کوچہ میں لگی فتویٰ بازی کی فیکٹریوں کو بند کریں اور یہ کام صرف اورصرف کچھ مخصوص اداروں مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل کو دے دیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم مزید فرقوں میں بٹتے رہیں گے۔افسوس ہم سب محمدﷺ سے محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگراس عظیم ہستی کی تعلیمات اورسنت پرعمل کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں۔

☆☆☆